مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد الہند

اسرارِ حیات

زندگی کے مختلف گوشوں پر مختلف اوقات میں اصلاحی
تعمیری اور دعوتی نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ

مولانا محمد رضوان القاسمی

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد الہند

نام کتاب : اَسرارِ حیات (سِرّ الحیَاۃ)
نام مؤلف : مولانا محمد رضوان القاسمی
کتابت : مولانا محمد عرفان عالم قاسمی ۔ سید مسرور احمد
طبع اوّل : جون ۲۰۰۲ء
تعداد : گیارہ سو
قیمت :

ناشر
دارالعلوم سبیل السلام
مدینۃ العلم، حیدرآباد (الہند)
DARUL ULOOM SABEELUSSALAM
MADINATUL ILM, HYDERABAD. 500005
Tel : 4440450 Fax : 4441835
Email : mrqasmi@hotmail.com

بسم الله الرحمن الرحيم

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

اقبالؔ

فہرست عنوانات

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل

یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بارِ دوش ہے

اقبالؒ

صرف دو باتیں

مولانا محمد رضوان القاسمی کا شمار اس وقت ملک کے ممتاز .نام ور اور صفِ اول کے علماء میں ہوتا ہے اور ان کی شناخت مسجدِ عامرہ کے خطیب، دارالعلوم سبیل السلام کے بانی و ناظم اور ملک کے مؤقر روزنامہ سیاست" کے کالم نگار کی حیثیت سے ملک ہی میں نہیں ملک سے باہر بھی اتنی عیاں ہے کہ ان کی کسی تحریر کے تعارف، یا کسی کتاب پر "مقدمہ" کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔

ویسے بھی ان کے بارے میں میرا کچھ لکھنا اس وجہ سے مخدوش ہے کہ میرا ان کا حد سے زیادہ قرب سبھوں کو معلوم ہے، جس کے بعد سچی شہادت بھی مشتبہ اور واجبی سی تو یف بھی "ثنا خوانی" کے زمرہ میں شمار ہونے لگتی ہے، اس لئے "مقدمہ نگاری" سے معذرت کے ساتھ صرف دو باتیں عرض ہیں، جن سے شاید کتاب کے قاری کو اس کے مندرجات سے فائدہ اٹھانے میں مدد ملے۔

(الف) صاحب کتاب کا شمار زمانہ کے نبض پر ہاتھ اور "صلح کل" کی پالیسی رکھنے والے ایسے علماء اور مفکروں میں ہوتا ہے، جن کی تحریریں "حکیمانہ" ہوا کرتی ہیں اور جن کی ہر سطر حکمت و موعظت سے لبریز، نتیجہ خیز اور از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق ہوا کرتی ہے اور اپنے پڑھنے والے کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ اسے مصنف تحریر کا ہم خیال بن جانا ہی پڑتا ہے۔

(ب) مولانا محمد رضوان القاسمی کا جس طرح مطالعہ وسیع، ذہن رسا اور قلم

سیال ہے، اسی طرح اردو زبان وادب پر ان کو بے حد عبور حاصل ہے اور ہر موقع کے لحاظ سے منتخب اور تعمیری اشعار ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں، جس سے پڑھنے والے کو نہ صرف پند وموعظت کا فائدہ ہوتا ہے۔ بلکہ اسے زبان وادب کی چاشنی بھی خوب ملتی ہے اور وہ پڑھتا اور سر دھنتا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب مولانا کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ ان کے متفرق اصلاحی وتعمیری مضامین کا مجموعہ ہے اور ان متفرق مضامین میں بھی مولانا کی شخصیت پورے طور پر نمایاں ہے اور مطالعہ کی وسعت کے ساتھ اخذ نتائج کی بے پناہ صلاحیت ان سے ظاہر ہے۔

امید ہے کہ مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب کی دینی مسائل میں رہنمائی ہی سے نہیں بلکہ جو لوگ کلیم عاجز کی شاعری میں چراغ اور حضرت امجد حیدر آبادی کے مصلحانہ وحکیمانہ رباعیات سے مولانا کی تحریروں کے ذریعہ روشناس ہوئے ہیں ان کو اس مجموعۂ مقالات میں بھی قیمتی لعل وگہر ملیں گے اور مولانا کی شگفتہ وشاداب تحریریں ان کی زندگی کا راز کھولنے اور "اسرار حیات" کو ان پر واشگاف کرنے میں معاون ثابت ہوں گی اور لکھنے والے کے لئے یہ مجموعہ ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگا۔

۳ ربیع الآخر ۱۴۲۳ھ
۱۵ جون ۲۰۰۲ء

بدر الحسن القاسمی - کویت
(صدر المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء)
امارت شرعیہ پٹنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مؤلف

راقم الحروف وقت و حالات، اندرونی داعیے اور خارجی تقاضے کے تحت مختلف موضوعات پر مضامین لکھتا رہا ہے۔ یہ مضامین علمی، تحقیقی، دینی، دعوتی اصلاحی، ادبی ہر طرح کے رہے ہیں۔ چونکہ ایک عرصہ سے میری قلمی وابستگی "روزنامہ سیاست حیدرآباد" سے چلی آرہی ہے، اس لئے یہ مضامین اسی میں طبع ہوتے رہے ــــ "سیاست" نے اپنی سنجیدہ اور باوقار صحافت کے ذریعہ باشعور قارئین کا وسیع تر حلقہ بنایا ہے۔ اس حلقہ کی طرف سے ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا مسلسل تقاضا رہا۔[1] اس مخلصانہ تقاضے نے مجھے آمادہ کیا کہ ان بکھرے ہوئے مضامین کو یکجا کردیا جائے، شاید افادیت اور نافعیت کا کوئی پہلو نکل آئے۔ "اسرارِ حیات" کے نام سے تیئس[۲۳] مضامین کا یہ پہلا مجموعہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے[2] اسی خارجی تقاضے اور دل کے داعیہ کو عملی شکل دینے کی ایک کوشش ہے۔[3] وہ تمام حضرات جو اس مجموعہ کی اشاعت کے

---

(۱) میرے والد محترم مولوی محمد حبیب الحسن حسینیؒ (وفات ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء) بھی اپنی زندگی میں ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ برادرِ عزیز محمد سلمان صدیقی (مقیم دُبئی) اور مولانا عبدالمنان صدیقی سبیلی بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے رہے ــــ محبت آمیز اس فرمائش اور خواہش کا خیال بھی میرے لئے ضروری تھا۔

(۲) کتاب کا نام "اسرارِ حیات" علامہ اقبال کے ایک شعر سے ماخوذ ہے، یہ شعر اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۴۴ پر درج ہے۔

(۳) چونکہ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، اس لئے بعض مضامین میں جزوی طور پر تکرار ہے، دعوتی و اصلاحی مضامین میں اس طرح کے مکررات قابلِ گوارا ہیں۔

سلسلہ میں محرک اور معاون رہے ہیں، وہ میری جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جزاھم خیرا الجزاء۔

دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کے باذوق اور باصلاحیت استاذِ تفسیر و حدیث عزیزِ مکرم مولانا عبد الباسط ندوی نے ان مضامین کو جمع کرکے کتابت، طباعت اور اشاعت کے جملہ امور کو اپنے بعض رفقاء کے ساتھ حسن و خوبی اور مستعدی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے رفقاء کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور اس کتاب کے مؤلف، ناشر، معاون اور قاری سب کے حق میں مفید بنائے۔

ادبی مضامین کا ایک مجموعہ انشاء اللہ جلد ہی "متاعِ قلم" کے نام سے منظرِ عام پر آئے گا، "سیرتِ نبوی ﷺ" اور "شخصیات" پر لکھے ہوئے مضامین الگ سے ترتیب دئے جارہے ہیں، مزید دیگر مضامین کی ترتیب کا سلسلہ جاری ہے، "سیاست" کے یک شنبہ ایڈیشن میں "آپ کے سوال" کے عنوان سے راقم الحروف کا جو ہفتہ واری کالم گزشتہ چار پانچ سال سے مسلسل آرہا ہے، اس کی موضوعاتی ترتیب کا کام بھی بحمد اللہ جاری ہے ــــــ اللہ تعالیٰ علم اور دین کے سلسلہ میں کئے ہوئے تحریری کام کو قبول فرمائے اور باقی ماندہ کام کو اخلاص کے ساتھ انجام تک پہنچانے کی توفیق دے، سچ ہے ؎

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

محمد رضوان القاسمی
(ناظم: دار العلوم سبیل السلام، حیدر آباد)

۲ر ربیع الآخر ۱۴۲۳ھ
۱۴ر جون ـــ ۲۰۰۲ء
جمعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک نسخۂ اکسیر

" واللہ! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو اس شہر کے لوگ نہیں بولتے ہیں۔ ——— عداس نصرانی نے پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جب بسم اللہ کا کلمہ سنا تو وہ حیرت کے ساتھ گویا ہوا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپؐ طائف کے انتہائی تکلیف دہ سفر سے واپس ہو رہے تھے، زخموں سے چور اور غموں سے نڈھال تھے، اوباش کے شر سے بچنے اور کچھ آرام لینے کی غرض سے آپؐ ایک باغ میں داخل ہوئے، یہ باغ ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ باغ میں داخل ہونے کے بعد آپؐ انگوروں کے سایہ میں بیٹھ گئے۔

نبیؐ کی ایک پُرتاثیر دُعاء

جب اس باغ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ اطمینان حاصل ہوا تو آپؐ نے اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں دعا مانگنی شروع کی، اس دُعا کے الفاظ بھی عجیب و غریب ہیں اور کسی موقع پر آپؐ سے ایسے الفاظِ دعا منقول نہیں، وہ دُعا یہ ہے :-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَشْكُوْ اِلَيْكَ
ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِیْ
وَهَوَانِیْ عَلَى النَّاسِ وَاَنْتَ
اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ وَاَنْتَ
رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ فَاَنْتَ
رَبِّیْ اِلٰى مَنْ تَكِلُنِیْ اِلٰى
بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِیْ اَوْ اِلٰى
عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِیْ اِنْ
لَّمْ تَكُنْ سَاخِطًا عَلَیَّ
فَلَا اُبَالِیْ وَلٰكِنَّ
عَافِيَتَكَ هِیَ اَوْسَعُ لِیْ
اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ
الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ
الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ
عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ مِنْ اَنْ
تُنْزِلَ لِیْ غَضَبَكَ
لَكَ الْعُتْبٰى
حَتّٰى تَرْضٰى
وَلَا حَوْلَ
وَلَا قُوَّةَ

یا اللہ میں آپ سے شکایت کرتا ہوں اپنی
قوت کے ضعف اور کمی کی اور اپنی تدبیر
کی ناکامی کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی
خفت و بے توقیری کی اور آپ تو سب رحم
کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے
ہیں اور آپ کمزوروں کی پرورش فرمانیوالے
ہیں۔ آپ ہی میرے رب ہیں۔ آپ مجھے کس
کے سپرد کرتے ہیں، کیا ایک غیر آدمی کے جو
مجھ پر حملہ کرے یا کسی دشمن کے جس کو آپ نے
میرے معاملہ کا مالک بنا دیا ہے (کہ جو چاہے
کرے) اگر آپ مجھ پر ناراض نہ ہوں تو مجھے
ان سب چیزوں کی پروا نہیں لیکن آپ کی
عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے (اس
کو طلب کرتا ہوں) میں آپ کی ذاتِ مبارک
کے نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے تمام اندھیریاں
روشن ہو جاتی ہیں اور اس کی بنا پر دنیا و
آخرت کے سب کام درست ہو جاتے ہیں
اس بات سے کہ مجھ پر اپنا غضب نازل فرمائیں
ہمارا کام ہی یہ ہے کہ آپ کو راضی کرنے اور
منانے میں لگے رہیں جب تک کہ آپ راضی نہ
ہو جائیں اور ہم تو کسی برائی سے بچ سکتے

اِلّا بِاللّٰہ۔ نہیں نہ کسی بھلائی کو حاصل کر سکتے ہیں

بجز آپ کی مدد کے۔ (مظہری باختصار)

عتبہ اور شیبہ یہ دونوں بھائی ظالم کی شرارتوں اور آپؐ کی مظلومانہ بے بسی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، ان کے دل بہرحال انسان کے دل تھے، سنگ و خشت نہیں تھے۔ درد سے بھر آئے، رحم کا جذبہ طاری ہوا۔ انہوں نے اپنے نصرانی غلام عدّاس کو آواز دی، وہ حاضر ہوا۔ حکم یہ ملا کہ انگور کا ایک خوشہ لو اور طبق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہو یہ کھائیں۔ غلام نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی۔

قابلِ قدر عمل، حیرت انگیز سوال

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے طبق میں تازہ انگور کا بہترین خوشہ ہے، منعمِ حقیقی کی ہر نعمت کے قدر شناس تو آپؐ پہلے ہی سے تھے مگر جب اس غربت اور اجنبیت کے ماحول میں بھوک اور پیاس کی شدت کے وقت آپؐ نے یہ غیر متوقع ضیافت دیکھی تو دل قدر شناسی کی کیفیت سے اور بھی لبریز ہو گیا۔ ہاتھ انگور کی طرف ابھی بڑھنے نہیں پائے تھے کہ زبان پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا کلمہ آیا۔ عدّاس نے جب آپؐ سے یہ کلمہ سنا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اس نے سوچا کہ کفر و شرک کے ظلمت کدہ میں رحمٰن و رحیم کی کافوری شمع کیوں اور کیسے روشن ہوئی وہ اپنے اس احساس کو چھپا نہ سکا، بے اختیار اس کی زبان پر آیا:

"واللہ! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو اس شہر کے لوگ نہیں بولتے ہیں"

اس کے اس تعجب خیز جملے کو سُن کر آپؐ نے عدّاس سے دریافت کیا

کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ عداس نے جواب دیا میں نصرانی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا تم اللہ کے نیک بندے یونس بن متی علیہ السلام کی بستی کے رہنے والے ہو، ہاں میں اسی بستی کا رہنے والا ہوں مگر یہ بتائیے کہ آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ میرے بھائی ہیں کیوں کہ وہ بھی اللہ کے نبی تھے اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔"

عاشقانہ جواب

یہ سُن کر عداس آپؐ کے قدموں پر گر پڑا اور آپؐ کے سرِ مبارک اور ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا، عتبہ اور شیبہ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس نے ہمارے غلام کو تو خراب کر دیا جب عداس لوٹ کر ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ عداس تجھے کیا ہوا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینے لگا۔ عداس نے جواب دیا میرے آقا! اس وقت زمین پر ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ انہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتلائی جو نبی کے سوا کوئی بتلا نہیں سکتا انگور کھانے سے قبل "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہنے کا جو عمل ان کا رہا ہے وہ بھی میرے لئے بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ خدا کی کسی نعمت سے استفادہ کرنے سے قبل خدا کا نام لینا اور اس کے رحمٰن و رحیم ہونے کا ذکر کرنا یہ کوئی معمولی واقعہ تو نہیں، یہ ایک انسان کی عبدیت اور بندگی کا کمال ہے۔ ایسے باکمال انسان کی عقیدت و محبت میں میرا دل اگر گرفتار ہوگیا تو تعجب کیوں اور حیرت کیسی؟ اس عاشقانہ جواب کے بعد عتبہ اور

شیبہ کیلئے سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

بسم اللہ کی برکت

یہ واقعہ ہے کہ اس موقعہ پر نصرانی غلام عداس نے بسم اللہ کی برکت اور اس کی معنویت اور حقیقت کو بجا طور پر محسوس کیا۔ جس دل میں خدا کی عظمت اور کبریائی نے جگہ پائی ہو اور اس نے یہ جانا ہو کہ

ع "جو کچھ ہے سب خدا کا۔ وہم وگماں ہمارا"

پھر یہ ناممکن ہے کہ وہ بسم اللہ کے معنی خیز کلمہ کی معنویت کا ادراک نہ کرے۔ ایسے دل کے لئے یہ کلمہ حد درجہ وجد آفریں اور نشاط انگیز ہے قوت وطاقت کا خزانہ، نصرت ودستگیری کا سرچشمہ اور برکت وزیادتی کا سیل رواں ہے۔

بسم اللہ کی تاریخی حیثیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کرتے تھے، اس رسم جاہلیت کو مٹانے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو جبرئیل امین لے کر آئے اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا، اِقرأ باسمِ ربّکَ (آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ) محققین علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کے علاوہ دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئیں ہیں، گویا قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کے آغاز میں بسم اللہ کی حیثیت "قدر مشترک" کی ہے۔ البتہ بسم اللہ الرحمٰن

الرحیم (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں) اپنی مکمل شکل میں قرآن اور امتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ابتدا میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے "باسمِكَ اَللّٰهُمَّ" کہتے اور لکھاتے تھے۔ جب آیت بِسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی تو انہیں الفاظ کو اختیار فرما لیا اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہو گئی

بسم اللہ سے ہر اچھے کام کا آغاز

قرآنِ حکیم میں جا بجا اس کی ہدایت ہے کہ ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر اچھا اور قابلِ قدر کام جو بِسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ نامکمل اور بے برکت رہتا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسم اللہ کہو، چراغ گل کرو تو بِسم اللہ کہو، برتن ڈھکو تو بِسم اللہ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے، جانور کو ذبح کرنے کے وقت بِسم اللہ پڑھنے کی ہدایات قرآن و حدیث میں بار بار آئی ہیں۔ باخبر حضرات اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ بِسم اللہ کا کلمہ قرآن مجید میں بجز ایک سورت (توبہ) کے، ہر سورت کی ابتدا میں لایا گیا ہے۔ یعنی (۱۱۳) بار اور سورۂ النمل کے اندر عبارت میں بہ طور آیت قرآنی (۳۰ ویں آیت) بھی آیا ہے۔ تحریر کے شروع میں بھی بِسم اللہ لکھنا مسنون ہے۔ البتہ اگر اس کا اندیشہ ہو کہ وہ کاغذ

بے ادبی کا شکار ہو جائے گا تو مناسب یہ ہے کہ ادائے سنت کے لئے زبان سے بسم اللہ کہہ لے، تحریر میں نہ لکھے، مگر تعلیم اور احکام بسم اللہ سے واقف کرانے کی صورت مستثنٰی ہے، ایسی شکل میں قارئین کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسے حصہ کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں۔

بسم اللہ کی حکمت

مفتی اعظم مولانا محمد شفیعؒ (۱۸۹۶ــــــ۱۹۷۶) نے اپنی تفسیر میں ایک جگہ بسم اللہ کی حکمت بیان کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ "اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پوری زندگی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلف وفاداری کی تجدید کرتا رہے کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادے اور اس کی امداد کے نہیں ہوسکتا جس نے اس کی ہر جائز نقل وحرکت اور تمام حلال معاشی ودنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنا دیا ہے۔ یہ عمل کتنا مختصر ہے کہ نہ اس میں کوئی وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت، اور فائدہ کتنا کیمیاوی اور بڑا ہے کہ دنیا بھی دین بن گئی۔ غور کیجئے کہ اسلام کی صرف اسی ایک ہی مختصر سی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بسم اللہ ایک نسخۂ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے۔" (معارف القرآن جلد اول ص۷۶،۷۵)

بسم اللہ ایک قوت بخش ذکر

مشہور مفسر اور ادیب مولانا عبد الماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲ــــــ۱۹۷۷) اپنی

تفسیر کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں :-

"جو شخص کسی کام کو خدائے رحمٰن ورحیم کا نام لے کر شروع کرتا ہے وہ عملاً اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ میرا ضمیر پاک ہے، میری نیت مخلصانہ ہے، میرا مقصد اعلیٰ ہے اور میں توحید کا پرستار ہوں، ایک طرف شرک سے اور دوسری طرف الحاد سے بیزار، غرض بسم اللہ سے بڑھ کر قوت بخش اور اس سے زیادہ روح و اخلاق کو بلند کرنے والا ذکر کوئی اور نہیں، بسم اللہ خوان اپنی اور سب کی طرف سے قطع نظر کر کے تکیہ کر لیتا ہے اللہ کی ذات اور صفاتِ رحمانیت ورحیمیت پر۔"

(تفسیر ماجدی، سورۂ فاتحہ حاشیہ نمبر ۸)

سلام اُس پر
کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا

آئیے اقبال کے "دانائے سبل" "ختم الرسل" "مولائے کُل" کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے ماہر سے مستعار لے کر بصد آداب سلام پیش کریں:

"سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا"

واقعہ یہ ہے کہ مہد سے لے کر لحد تک یا دوسرے لفظوں میں گود سے لے کر گور تک کی جو درمیانی زندگی ہے، یہی نہیں بلکہ اس کے بعد جو دوسری لامتناہی زندگی ہے۔ ان سب کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھایا جس انداز سے سمجھایا، ویسا کسی نے نہیں سمجھایا، آپؐ کے سمجھائے ہوئے کو کوئی سمجھ لے تو سمجھئے کہ اس کی زندگی میں بہار آئی، نکھار آیا، قرار آیا۔

انسان کی زندگی کی مختلف کیفیات ہیں، دائرے ہیں، زاویئے ہیں، ان کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنا ہے اور اختصار کے ساتھ مجموعی طور پر دیکھنا ہے کہ زندگی کے راز کو کس کس طرح سے سمجھایا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے دیکھئے اس بچہ کی طرف، ماں کے پیٹ سے ابھی ابھی اس نے مادر گیتی میں قدم رکھا ہے، زندگی کا راز سمجھانے والے آخری نبیؐ نے سمجھایا کہ اسے کسی رنگ میں رنگنے کی ضرورت نہیں ہے (جیسا کہ نصاریٰ کے یہاں رسم رہی ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد ساتویں دن ایک خاص قسم کے رنگین پانی میں نہلا کر یہ سمجھتے تھے کہ بچّہ نصرانی بن گیا، اس رسم کو

"بپتسمہ" کہتے ہیں، اسے بس اللہ کے رنگ میں رنگ دو۔ ایمان کی حقیقت اتار دو، یہ رنگ نہایت پکا ہے۔ اس کی ظاہری صورت یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کے کلمات کہو۔ کوئی اچھا نام رکھ دو۔ ایسا نام جس سے اللہ کی بندگی ظاہر ہوتی ہو تو وہ بہت بہتر ہے (جیسے عبداللہ، عبدالرحمٰن لڑکوں کے لئے اور امۃ اللہ اور امۃ الرحمٰن وغیرہ لڑکیوں کے لئے) عقیقہ بھی کر دو، اس سے بچہ عام آفات و بلیات سے محفوظ رہے گا۔ ختنہ کی سنت پر بھی عمل ہونا چاہیئے۔ اس میں متعدد حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں، بچہ کچھ بولنے لگے، تو سب سے پہلے اللہ کا نام اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سکھاؤ۔ سورۃ الفرقان کی دوسری آیت بھی یاد کرا دو۔ اس میں توحید کی پوری تعلیم کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے۔

مکتب کی تعلیم کا وقت آئے تو بنیادی طور پر تین طرح کی تعلیم سے غفلت نہیں برتنا چاہیئے، (۱) ایسی تعلیم جس سے اس کے دل میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا ہو، دوسرے نمبر پر نبیؐ کے آلؓ، صحابہؓ اور صالحین کی عظمت اور ان کی دینی خدمت کا تاریخی حیثیت سے تعارف ہو اور تیسرے نمبر پر وسیع تر معنیٰ و مفہوم میں قرآن کی تعلیم، شروع ہی سے تعلیم کے ساتھ تربیت پر نگاہ ہو، لیکن بچہ جب سات سال کی عمر کو پہنچے تو اس فکر و اہتمام میں کافی اضافہ ہو جانا چاہیئے، تعلیم و تربیت کے اعتبار سے بچہ کی ابتدائی عمر نہایت اہم ہوتی ہے، اس سے بے توجہی اس کے لئے "بربادی" مول لینا ہے۔

زندگی کا راز سمجھانے والے نبیؐ نے تعلیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرمائی ہے، اس سلسلہ میں چند کلیوں پر قناعت محمود و محبوب نہیں ہے، یہاں تو "بڑھے چلو" کی صدائے دل نواز ملتی ہے، دور دراز سفر کے لئے بھی کمربستہ ہونا چاہیئے "ستاروں کے آگے

جہاں اور بھی ہیں"۔ کا حوصلہ ملتا ہے، ثریا پر کمند ڈالنے کی تلقین کی گئی، اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھول کر ہر طرح کے علم و فن میں کمال درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے، البتہ ہر مسلم آبادی میں کچھ لوگ (علماء) ضرور ایسے رہیں جو قرآن و حدیث اور دین و شریعت کا تحقیقی اور تفصیلی علم رکھتے ہوں، تاکہ معروف و منکر حلال و حرام جائز و ناجائز، خدا کی مرضی اور نا مرضی کی تعلیم بخوبی اور یکسوئی کے ساتھ جاری رہے، دعوتی نقطۂ نظر سے مختلف زبانوں میں مہارت بھی حاصل کی جائے۔

انسانی زندگی میں تعلیم کے ساتھ معاشی استحکام بھی ضروری ہے، اس سلسلہ میں زندگی کا راز سمجھانے والے نبیؐ کی جو ہدایات ملتی ہیں، ان سے واضح ہے کہ مفت خوری کی عادت نہیں ڈالنی چاہیئے، سوال کی ذلت اٹھانے سے بچنا چاہیئے، کسب معاش کے لئے کسی بھی جائز پیشہ کو معیوب نہیں سمجھنا چاہیئے، معاشی سرگرمی بھی راہِ خدا میں جد و جہد کا ایک حصہ ہے، ناجائز اور باطل طریقہ سے اجتناب کرنا چاہیئے، کاروبار میں صداقت اور دیانت کو اپنانا چاہیئے، فقر و افلاس بسا اوقات انسان کو کفر تک لے جاتا ہے، اس لئے اپنے معاشی موقف کو بہتر طریقہ پر مضبوط رکھنا چاہیئے، لڑکا ہو یا لڑکی، مناسب جوڑا مل جانے کے بعد شادی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے، شادی سادی ہو اور سنت کے مطابق، آپؐ کے فرمان کے بموجب "سب سے باعظمت اور بابرکت نکاح وہ ہے، جس میں کم خرچ ہو" میاں بیوی باہمی طور پر عفو و درگزر سے کام لیں، ایک دوسرے کے جذبات، احساسات اور نفسیات کا خیال رکھیں، اس سے ازدواجی زندگی خوشگوار گزرے گی، خاندانی روابط میں بہتری ہو، جو ٹوٹے اس سے جُڑ جانا چاہیئے، فرقِ مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے ہر رشتہ دار سے اچھا سلوک کرنا چاہیئے، ماں کے قدموں کے نیچے (یعنی ان کی خدمت و اطاعت میں) جنّت ہے، باپ جنّت کا دروازہ ہے، اولاد

کے حقوق کو جاننا چاہیے۔ پڑوسی کے حقوق پہچاننا ایمان کی علامت ہے۔ جو شخص خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے وہ مومن نہیں ہو سکتا جس کی اذیت اور بدی سے پڑوسی محفوظ نہیں رہے وہ بھی صاحب ایمان نہیں، ایمانی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ مہمان کا اکرام کیا جائے، استاذ کا احترام ضروری ہے، اس سے علم کے دروازے کھلتے ہیں اور توفیق ارزانی بارگاہ الٰہی سے نصیب ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور جو اپنے گھر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک میں سب سے بڑھا ہوا ہو، اپنے آپ کو اس بات کا خوگر بنانا چاہیے کہ لوگ اگر اچھا سلوک کریں گے جب بھی میں اچھا سلوک کروں گا اور اگر وہ بُرا سلوک کریں گے تو میں ان پر ظلم نہیں کروں گا۔ کسی سے دوستی اور دشمنی خدا کے لئے ہو، جو شخص کسی کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ دیتا ہے، وہ گویا اسلام سے نکل جاتا ہے، غیبت، ٹوہ میں پڑنا، افواہ طرازی، الزام تراشی، مذاق اڑانا۔ یہ سب چیزیں باہمی تعلقات کی دیوار میں شگاف پیدا کرتی ہیں، اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں، حیا بھی ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے، مومن کبھی طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، بدگو اور زبان دراز نہیں ہوتا، وہ اپنی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسروں کو محفوظ رکھتا ہے، راستہ کو خراب کرنا اور وہاں تکلیف دہ چیزوں کو ڈالنے کا کیا ذکر، وہ ایسی چیزوں کو راستہ سے ہٹاتا ہے، چغل خوری کی خو نہیں ہوتی ہے، کینہ سے سینہ پاک رکھتا ہے، مومن کھجور کے درخت کی طرح اپنے پورے وجود سے دوسروں کے لئے نفع بخش ہوتا ہے، مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کے بارے میں کوئی خطرہ نہ ہو، مومن مصیبت میں صبر اور نعمت پر شکر ادا کرتا ہے، عُسر ہو یا یُسر، تنگی ہو یا فراخی، ہر حالت میں وہ مطمئن رہتا ہے اور اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھتا ہے، ملنے پر اکڑتا نہیں ہے اور نہیں ملنے پر مایوس نہیں ہوتا خود بینی

اور بد بینی سے احتراز کرتا ہے۔ آپس کے معاملہ میں سخت گیر نہیں ہوتا، وہ عفو و درگزر سے کام لیتا ہے، صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے، مصالحت اور مفاہمت میں سکون کے راز کو پاتا ہے، وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اتفاق و اتحاد کی اصل اور جڑ تواضع ہے، جھکاؤ میں کام کا بناؤ ہے اور شدت میں کام کا بگاڑ۔ سادگی انسان کی اہم اور معیاری صفت ہے، تصنع اور بناوٹ سے حقیقت کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور آدمی کی شخصیت عیب دار بن جاتی ہے۔

بہترین آدمی وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، انسان کی بھوک پیاس اور علاج کی ضرورتوں کی تکمیل کا مطلب خدا کو پانا ہے، کسی کی حاجت روائی کی گئی تو اللہ اس کی حاجت روا بن جاتے ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، کسی کی چھوٹی سی مصیبت کو کم کرنے کے معنی ہیں دنیا اور آخرت کی اپنی بڑی مصیبتوں کو اللہ تعالیٰ سے کم کرانا، بیواؤں کی خبر گیری، یتیموں کی سرپرستی غریبوں کی مدد، معاشی رہبری، اقتصادی رہنمائی، معاشی کفالت، یہ تمام نیک کام ہیں جس کے باعث اللہ تعالیٰ اپنی رضا کا پروانہ عطا فرماتے ہیں، معاملہ کو ہمیشہ صاف رکھنا چاہیے، اس میں دھوکہ بازی سے اللہ کی نصرت روٹھ جاتی ہے، مالی بد دیانتی سے خدا کی رحمت منہ موڑ لیتی ہے، اس میں دنیا کی رسوائی، آخرت کی تباہی بھی ہے۔ سود، رشوت، چوری ڈکیتی، فریب دہی کے پیسے ناجائز اور حرام ہیں، بدکاری، شراب نوشی اور نشہ آور چیزوں کے استعمال سے قطعاً احتراز کیا جائے، ان لعنتوں میں پڑنے سے دولت ضائع ہوتی ہے صحت برباد ہوتی ہے، روحانی دنیا اُجڑ جاتی ہے، دوزخ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ گھات میں لگ جاتی ہے۔

زندگی کا راز سمجھانے والے آخری نبیؐ نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ طہارت و نظافت اور جسم و لباس کی پاکیزگی نصف ایمان ہے، مومن وہ ہے جس کا گھر آنگن، صحن، اردگرد سب صاف ستھرا رہتا ہے، ماحولیات کو بہتر بنانے کے لئے آج سو سو جتن کئے جا رہے ہیں، مگر حیات کے راز کو پانے والے نبیؐ نے بہت پہلے ماحولیات کو بہتر بنانے

کے لئے مختلف انداز سے جو تعلیمات دی ہیں وہ بے نظیر ہیں اور کسی بھی ریسرچ اسکالر کے لئے ریسرچ کا اہم موضوع ہے۔ آپ کی ایک حدیث سے واضح ہے کہ ہر مرض کا علاج ہے اور ہر بیماری کی دوا خالقِ کائنات نے پیدا فرمائی ہے، تلاش اور جستجو سے اس کا سراغ لگانا، یہ ہر دور کے انسان کا کام ہے، طبِ نبویؐ تو ایک مستقل عنوان ہے، جس میں علاج و معالجہ کے فن کے لئے ان گنت نظری اور عملی سامان ہے، آپؐ کی متعدد ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کے سرچشمے جاری رہنے چاہئیں، ان کے سوتے خشک نہ ہونے پائیں، زراعت، تجارت، باغبانی، آب رسانی، ذرائع ابلاغ میں حقیقت بیانی اور صداقت شعاری، روشنی، سواری حیوانوں کی افزائشِ نسل، تعمیرات، صنعت و حرفت، ٹکنالوجی، بوقت ضرورت حربی اور جنگی تکنیک، سائنٹیفک اندازِ فکر، بلدیاتی نظام، ان میں سے کون ایسی چیز ہے جس کے بارے میں کہیں اشارتاً اور کہیں صراحتاً آپؐ نے نہ فرمایا ہو، ان میں سے ہر ایک موضوع پر نبوی تعلیمات کا مطالعہ نگار کے لئے سرمۂ بصارت و بصیرت ہے۔ آپؐ کے فرمان سے ظاہر ہے کہ شاعری اپنی تاثیر میں جادو سے کچھ کم نہیں، بعض اشعار حکمت و دانائی سے لبریز ہوتے ہیں، البتہ ادب اور شاعری کے ظرف کو ملحدانہ اور غیر حقیقت پسندانہ خیالات سے خراب نہیں کرنا چاہئے، واعظ اور مقرر کو حددرجہ ذمہ دار اور حقیقت شعار ہونا چاہئے، غیر ذمہ دار اور فتنہ پرداز واعظ اور مقرر کے بارے میں آپؐ کا بیان ہے کہ قیامت کے دن اس کی زبان اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جائیں گے۔

عبادت کے ذوق و شوق سے اپنی روح کو توانا کرنا اور آخرت کو بنانا چاہئے مالک اور ملازم، آقا۔۔ باہم ایک دوسرے کے حقوق پورے طور پر ادا کرتے رہیں، تاکہ ایک طرف سے شکایت اور دوسری طرف سے اسٹرائک کا موقع نہ آئے، تقویٰ اور

پرہیزگاری فضیلت کا معیار ہے، نہ کہ حسب نسب اور قبیلہ و خاندان، وطنی، علاقائی، لسانی، یونی نسلی عصبیتیں ملک اور سماج میں تباہی اور بربادی لاتی ہیں، اُخوت اور مساوات کے درس کو عام کرنا چاہیئے، ہر موقع اور ہر کام کے لئے آداب بتا دئے گئے ہیں، جن کی رعایت سے کام میں برکت، سہولت اور زینت آتی ہے۔ صبح و شام اور روز و شب کے لئے دعائیں ہیں، جن کے اہتمام سے خدا سے تعلق مستحکم ہوتا ہے اور اعمال میں نورانیت آتی ہے۔ رات میں جلد سونا چاہیئے۔ تاکہ صبح سویرے بیدار ہوکر خدا کے دربار میں سورج نکلنے سے پہلے حاضری دے کر دن کے کام کا آغاز کرسکے، رات کو لغویات اور دن میں فضولیات میں مشغول ہونا اپنی زندگی کی قسمت کو سلانا اور خدا کی بارگاہ میں اسے معتوب بنانا ہے، عمر کی کوئی بھی منزل ہو اُسے ذمہ دارانہ اور حوصلہ مندانہ گزارنا چاہیئے، عقلمند شخص کے شب و روز کی تقسیم، زندگی کا راز بتانے والے نبیؐ نے اس طرح کی ہے کہ (۱) وہ خدا سے باتیں کرے (عبادت و طاعت کے ذریعہ (۲) اپنی ذات کا محاسبہ کرے (۳) خدا کی تخلیق میں غور کرے (۴) کھانے پینے کی ضرورتوں کے لئے وقت نکالے۔ آپؐ کے فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وقت نہایت قیمتی ہے، اس کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

زندگی کا راز بتانے اور سمجھانے والے نبیؐ کا بیان ہے کہ "میرے ربؐ نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے (۱) کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں (۲) غصہ میں ہوں، یا خوشی میں ہمیشہ انصاف کی بات کہوں (۳) محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں اعتدال پر قائم رہوں (۴) جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں (۵) جو مجھے محروم کرے، میں اسے دوں (۶) جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں (۷) میری خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو، (۸) میرا بولنا یادِ الٰہی کا بولنا ہو (۹) میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

ایک مرتبہ آپؐ کے چچازاد بھائی، داماد اور خلیفۂ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے آپؐ سے سوال کیا کہ آپ کی اپنی زندگی کیسی ہے؟ تو جواب میں ارشاد فرمایا: (۱) معرفت

میرا راس المال (اصل پونجی) ہے (۲) عقل میرے دین کی جڑ ہے (۳) محبت میری بنیاد ہے (۴) شوق میری سواری ہے (۵) ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے (۶) اعتماد میرا خزانہ ہے (۷) حزن اور اندوہ دل میرا رفیق ہے (۸) علم میرا ہتھیار ہے (۹) صبر میرا لباس ہے (۱۰) رضا میری غنیمت ہے (۱۱) عجز میرا فخر ہے (۱۲) زہد میرا حرفہ ہے (۱۳) یقین میری خوراک ہے (۱۴) صدق میرا ساتھی ہے، (۱۵) اطاعت میری عزت اور بچاؤ ہے (۱۶) جہاد میری خصلت ہے (۱۷) اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

آخر میں زندگی کی ایک بڑی حقیقت کی طرف آئیے، جس پر یقین صلاح و فلاح کی ضمانت دیتا ہے، شخصی اور اجتماعی زندگی کو کامیاب بناتا ہے، سماج اور معاشرے سے ہر طرح کی سماجی اور معاشرتی بیماری کو دور کرتا ہے، وہ ہے آخرت کی زندگی کا تصور۔ آپؐ نے اپنی ابتدائی دعوتی زندگی میں صفا نامی پہاڑی سے خدا کی عظمت بیان کرنے کے بعد خدا کے بندوں کے نام یہ پیغام نشر فرمایا تھا: "خدا کی قسم تمہیں مرنا ہے، جس طرح تم سوتے ہو، اور پھر تم کو اٹھنا ہے جس طرح تم جاگتے ہو، اور ضرور تم سے حساب لیا جائے گا اور پھر اچھے کام کا اچھا بدلہ ہے اور برے کام کا برا بدلہ اور اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لئے باغ ہے، یا ہمیشہ کے لئے آگ"

زندگی کا راز بتانے اور سمجھانے والے نبیؐ کے دربار میں جب ہم آپ حاضر ہوئے تھے تو ادب کو پورے طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے سلام کیا تھا، اب آپؐ کی مجلس سے اٹھ رہے ہیں، اٹھنے کو دل تو نہیں چاہتا ہے مگر دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے اٹھ رہے ہیں، آئیے رخصت ہوتے ہوئے دوبارہ ماہرہی سے ان کا سلام مستعار لے کر نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ یہ عرض کریں کہ:

"سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا"

ذہن و دماغ میں آپؐ کی اس بافیض اور مبارک مجلس کی خوشبو بسائے ہوئے

اپنی قیام گاہ کی طرف واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں دیکھا کہ آپ پر ہمیشہ جان و دل فدا کرنے والے نواب بہادر یار جنگ ایک جلسۂ سیرت النبیؐ کو اپنی شانِ امتیازی کے ساتھ مخاطب کر رہے ہیں، دورانِ تقریر جب انہوں نے عقیدت و محبت سے سرشار اپنا یہ شعر سنایا تو کان کی راہ سے دل کی گہرائی میں اترتا چلا گیا، پھر دل اور زبان کا رابطہ بڑھا۔ اور زبان قیام گاہ کی واپسی تک اسی شعر کو دہرانے لگی، لذت تھی جو ختم نہیں ہو رہی تھی، لطف تھا جو ہر بار دوبالا ہو رہا تھا ؎

اے کہ تو فخرِ آدمی، واقفِ سرِّ عالمی
لوح و قلم سے بے نیاز تیرے علوم شش جہات

❋❋❋❋❋

قرآنِ حکیم ـــــ علم و تحقیق کا سرچشمہ

موت اور نیند سے متعلق آیت کے بارے میں ڈاکٹر آرتھر کے تاثرات

عرب کے جہالت زدہ اور تہذیب نا آشنا ماحول میں قرآنِ حکیم کی جو آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئی ہیں وہ "علم" اور "قلم" سے متعلق ہیں نزول کے اس انداز سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی نظر میں علم اور قلم کا کیا مقام و مرتبہ ہے، نزولِ قرآن کے زمانے پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ زمانہ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کی روشنی مدھم ہو چکی تھی، حضرت عیسیٰؑ کے فلسفۂ اخلاق کا نور بھی پھیکا پڑ چکا تھا، خدا شناسی کی طلب اور خود شناسی کی صلاحیت لوگوں سے چھن چکی تھی، انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے، ظلم و ستم کی حکمرانی تھی، باہمی جنگ و جدال کا دور دورہ تھا۔ ہر برائی سینہ پھلائے، سر اُبھارے محوِ رقص تھی، ایسے دور اور ایسے حالات میں قرآن اپنے ہاتھ میں "شمعِ علمی" کو تھامے جلوہ گر ہوا، جس کی روشنی ہر سُو پھیلی اور پھیلتی ہی چلی گئی جس کے نتیجے میں انسانیت اور شرافت کی تقدیر چمکی، علم و تحقیق کے چشمے پھوٹے، یارانِ نکتہ داں کو نکتہ سنجیوں کے لئے حوصلہ ملا، حکیموں

اور دانائوں کو حکمت و دانائی کے پھول سے دامن کو بھرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ بلکہ انہوں نے اس معاملہ میں قرآن کے "گل حسن" کو اتنا بسیار (زیادہ) پایا کہ وہ اس کا احاطہ نہ کرسکے اور اپنی نگہ کی تنگ دامانی کی شکایت پر مجبور ہوئے اور پھر سب سے بڑھ کر اس "کتاب ہدایت" کی برکت سے ہوا یہ کہ ؏

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے

اسلام کی آغوش میں

کہنے والے نے یہ تو حضرات صحابہؓ کے بارے میں کہا ہے، مگر اس کی مثال ہر زمانہ میں ملتی رہے گی۔ اس سلسلہ میں تازہ مثال ڈاکٹر آرتھر ایلیسن کی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا ایک علمی اور تحقیقی کام جاری تھا۔ موضوع سے متعلق قرآنِ حکیم کی ایک آیت جب ان کے مطالعہ میں آئی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اس آیت کو پانے کے بعد وہ کہنے لگے کہ "جس موضوع پر میں سالہا سال سے عرق ریزی کر رہا ہوں، قرآن نے اس سے متعلق حقیقتیں اپنے حسین اور دلکش پیرائے میں بہت عرصہ قبل بیان کر دی ہیں"۔ وہ اپنی اس دریافت کے بعد قرآن مجید کی حقانیت اور علمیت سے اس درجہ متأثر ہوئے کہ انہوں نے قاہرہ (مصر) میں سائنسی موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اَب ان کا اسلامی نام ڈاکٹر عبداللہ ہے۔ وہ ایک برطانوی یونیورسٹی میں شعبۂ الیکٹرونکس کے صدر بھی ہیں، انہوں نے اپنے اس

عزم کا اعلان بھی کیا ہے کہ وہ انگلینڈ میں ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کا خیال رکھتے ہیں جو غیر مسلموں بالخصوص نوجوانوں کو عصرِ حاضر کے جدید تقاضوں کو قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ کر کے ایسے شعور سے آشنا کر سکیں جو قرآن کا حق ہے۔ انہوں نے زور دیا ہے کہ مغربی دانشوروں اور سائنسدانوں کے لئے ضروری ہے کہ قرآن اور اسلام کو طبی اور سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھیں، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس لحاظ سے بھی قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کرنا خود مسلمانوں کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

ڈاکٹر آرتھر ایلین سے متعلق جو مزید معلومات بعض رسائل و جرائد کے مطالعہ سے حاصل ہوئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ گذشتہ چھ برس سے برٹش پیرا سائیکالوجی اور روحانی تعلیمات کے ادارے کے چیرمین ہیں اور اپنے اس منصب کی نوعیت کے پیشِ نظر انہیں مختلف مذاہب کے مطالعہ کا موقع ملا ہے، یورپ، امریکہ اور جاپان میں تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔ بہت سے تحقیقاتی مقالے تحریر کئے ہیں۔ متعدد ممتاز بین الاقوامی کمپنیوں نے ان کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ عیسائی تھے۔ قاہرہ کی جس کانفرنس میں انہوں نے شرکت کی تھی اس کا عنوان تھا "قرآن کریم کے طبی معجزات" وہ اس کانفرنس میں ایک پیرا سائیکالوجسٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے کانفرنس میں اپنا جو تحقیقی مقالہ پیش کیا، اس کا عنوان تھا "موت اور نیند کا قریبی تعلق"۔ انہوں نے اس موضوع سے متعلق انسانی دماغ پر عصرِ حاضر

کی جدید مشینوں اور الکٹریکل آلات سے تجربات کیئے جو دراصل ان کے دائرۂ تخصص میں آتے ہیں۔ اسی دَوران انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کا مطالعہ کیا، قرآنِ کریم نے ان کی جو رہنمائی کی اور اپنے تجربات کے نتائج کو جب انہوں نے قرآن کی روشنی میں دیکھا تو بے حد حیران کن نتائج سامنے آئے اور وہی قرآنی آیت جسے لوگ صدیوں سے تلاوت کرتے چلے آرہے ہیں، ان کی کایا پلٹ دینے کا ذریعہ بن گئی۔ قرآن مجید کا "موت اور نیند کا قریبی تعلق" پر نقطۂ نظر ان کی اپنی ریسرچ کا گواہ اور غیبی شاہد تھا، جس تحقیق پر انہوں نے برسہا برس کام کیا، قرآن مجید نے نہایت جامع الفاظ میں اس کو تھیوری کی شکل میں پیش کیا تھا اور یہ ایک ہی نہیں، قرآن ایسے بے شمار سائنسی معجزوں اور موشگافیوں کی حقیقت کا کھلے عام اعلان برسوں سے متعدد مقامات پر کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق "قرآن کی یہ آیت جو موت اور نیند سے متعلق ہے، میری تمام تر تحقیقات کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ یہی آیت دراصل مجھے اسلام کی آغوش میں لے آئی اور اَب میں بحمد اللہ مسلمان ہوں اور میرا نام عبداللہ ہے۔" سچ ہے:

حفاظت جس سفینہ کی انہیں منظور ہوتی ہے،
کنارے تک اسے خود لا کے طوفان چھوڑ جاتے ہیں

موت اور نیند، قرآن کی ایک آیت تحقیق کا سرچشمہ

ڈاکٹر عبداللہ (سابق ڈاکٹر آرتھر ایلین) نے موت اور نیند سے متعلق قرآنِ حکیم کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ سورۂ "الزمر" کی (۴۲) ویں آیت

ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے :

"اللہ جانوں کو قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت اور اُن (جانوں) کو بھی جن کی موت نہیں آئی ہے ان کے سونے کے وقت۔ پھر وہ اُن (جانوں) کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا فیصلہ نافذ کر چکا ہے اور باقی (جانوں) کو ایک وقت مقرر کے لئے واپس بھیج دیتا ہے۔ بے شک اس (سارے تصرفات) میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو سوچتے رہتے ہیں۔"

قرآن مجید کی اس آیت پر مزید تشریح اور تحقیق کی خاطر ڈاکٹر عبداللہ نے ڈاکٹر المشدلی کے ساتھ مل کر کام کیا اور سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت کردی کہ موت اور نیند ایک ہی عمل ہے۔ انہوں نے اپنی اس تحقیق کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے :۔

"ہم سائنسی تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جب کوئی شخص سوجاتا ہے تو کوئی چیز اس کے جسم سے نکل جاتی ہے۔ اور جب واپس آجاتی ہے تو وہ بیدار ہوجاتا ہے اور جب وہ نہیں آتی تو موت واقع ہوجاتی ہے۔ یہ وہی نکات ہیں جو قرآن نے صراحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔"

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بعض مفسّرین نے جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ لکھتے ہیں :

"ہر انسان کے دو نفس ہوتے ہیں، ایک تو نفس حیاتی جو موت کے وقت اس سے سلب ہوجاتا ہے کہ اس کے جانے سے جان چلی جاتی ہے اور دوسرا نفسِ ادراک جو نیند کے وقت اس سے جدا ہوجاتا ہے اور نیند

کے بعد واپس آجاتا ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ "اصل روح تو نیند کے وقت بھی جسم سے نکل جاتی ہے لیکن اس کا تعلق جسم کے ساتھ باقی رہتا ہے (جیسے آفتاب کا شعاعی تعلق کروڑوں میل دُور ہونے کے باوجود زمین سے قائم رہتا ہے) اور سوتا ہوا انسان (اسی جزئی تعلق کی بناء پر) خواب دیکھتا رہتا ہے۔ پھر جب بیداری کا وقت آتا ہے تو یہ روح چشم زدن (آنکھ جھپکنے) سے بھی کم میں جسم میں واپس آجاتی ہے" حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "ابن آدم میں نفس بھی ہوتا ہے، اور روح بھی، اور دونوں کا شعاعی تعلق مثل شعاعِ آفتاب کے ہوتا ہے پس نفس تو وہ ہے جو ادراک و شعور کا مبدأ ہے اور روح وہ ہے جس سے تنفس و حرکت قائم ہے۔ اور انسان جب سوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نفس کو قبض کرلیتا ہے نہ کہ اس کی روح کو" (تفسیر ماجدی بحوالہ مدارک)

مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ قبضِ روح کے معنی اس کا تعلق بدن انسانی سے قطع کردینے کے ہیں۔ کبھی یہ ظاہراً و باطناً بالکل منقطع کردیا جاتا ہے، اسی کا نام موت ہے، کبھی صرف ظاہراً منقطع کیا جاتا ہے، باطناً باقی رہتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صرف حِس اور حرکتِ ارادیہ جو ظاہری علامتِ زندگی ہے، وہ منقطع کردی جاتی ہے اور باطناً تعلق روح کا جسم کے ساتھ باقی رہتا ہے جس سے وہ سانس لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ روحِ انسانی کو عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرکے اس عالم سے غافل اور معطل کردیا جاتا ہے، تاکہ انسان مکمل آرام پاسکے، اور کبھی یہ باطنی تعلق بھی منقطع کردیا جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی حیات بالکل ختم

ہو جاتی ہے۔ مفتی صاحبؒ نے حضرت علیؓ کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونے کے وقت انسان کی روح اس کے بدن سے نکل جاتی ہے مگر ایک شعاع روح کی بدن میں رہتی ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے اور اسی رابطۂ شعاعی سے وہ خواب دیکھتا ہے پھر یہ خواب اگر روح کے عالم مثال کی طرف متوجہ رہنے کی حالت میں دیکھا گیا تو وہ سچّا خواب ہوتا ہے اور اگر اس طرف سے بدن کی طرف واپسی کی حالت میں دیکھا تو اس میں شیطانی تصرفات ہو جاتے ہیں، وہ رؤیاء صادقہ (سچّا خواب) نہیں رہتا۔" (معارف القرآن)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ "نیند کی حالت میں روح قبض کرنے سے مراد احساس و شعور، فہم و ادراک اور اختیار و ارادہ کی قوتوں کو معطل کر دینا ہے، یہ ایک ایسی حالت ہے جس پر اُردو زبان کی یہ کہاوت فی الواقع راست آتی ہے کہ "سویا اور مُوا برابر"، (اسی لئے نیند کو موت کی بہن کہا جاتا ہے) سورۂ زمر کی مذکورہ آیت سے اللہ تعالیٰ ہر انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ موت اور زیست کس طرح اس کے دستِ قدرت میں ہے۔ کوئی شخص بھی یہ ضمانت نہیں رکھتا کہ رات کو جب وہ سوئے گا تو صبح لازماً زندہ ہی اٹھے گا (جیسا کہ اکثر واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ آدمی رات کو سویا اور سویا کا سویا ہی رہ گیا۔ انگلستان کے ایک فرمانروا کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آچکا ہے) کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ ایک گھڑی بھر میں اس پر کیا آفت آسکتی ہے، اور دوسرا لمحہ اس پر زندگی کا لمحہ ہوتا ہے یا موت کا، ہر وقت سوتے میں یا جاگتے میں، گھر بیٹھے یا کہیں چلتے پھرتے

آدمی کے جسم کی کوئی اندرونی خرابی یا باہر سے کوئی نامعلوم آفت یکایک وہ شکل اختیار کر سکتی ہے جو اس کے لئے پیامِ موت ثابت ہو، اس طرح جو انسان خدا کے ہاتھ میں بے بس ہے وہ کیسا سخت نادان ہے اگر اسی خدا سے غافل یا منحرف ہو۔" (تفہیم القرآن)

نیند، ایک معنی خیز دعاء

اس میں کوئی شک نہیں کہ موت، نیند اور خواب کی باریکیوں پر ماہرینِ فن نے جو دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں وہ سب حکمتِ خداوندی کی ہی شرحیں اور تفسیریں ہیں۔ اس پسِ منظر میں حرا سے اُتر کر سوئے قوم آتے ہوئے "نسخہ کیمیا" (قرآنِ حکیم) ساتھ لانے والے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعاء کے الفاظ نگاہ میں لے آئیے، جسے آپؐ نے سوتے وقت پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے، باخبر نبیؐ کی یہ دعاء ایک انسان کو اپنی حیثیت سے کس اچھوتے طریقہ پر باخبر کرتی ہے اور بے بس و ناتواں بندہ کو اپنے حکیم و قدیر مولا اور آقا سے کس نرالے انداز سے التجا کراتی ہے، حقیقت و معنویت سے لبریز اس دعاء کو یاد کرنے اور کرانے، عمل کرنے اور کرانے کی نیت سے پڑھیے: "بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتُ جَنْبِي وَبِكَ اَرْفَعُهُ، اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِي فَارْحَمْهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ (ترجمہ) اے اللہ! میں تیرے نام سے اپنا پہلو بستر پر رکھتا ہوں اور تیرے نام کے ساتھ ہی اسے اٹھاؤں گا اس اثناء میں اگر تو میری روح قبض کر لے تو اس پر رحم کرنا اور اگر

واپس کرنا تو اس کی اس سے حفاظت کرنا جس سے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

سائنس دانوں سے اپیل

ڈاکٹر عبداللہ نے سورۂ زمر کی زیرِ تذکرہ آیت پر تأثرات کا اظہار کرنے کے بعد اپنے پُرجوش پیغام میں مغربی سائنسدانوں پر زور دیا ہے کہ" وہ اسلام کی عالمگیر صداقتوں پر ایمان لے آئیں جو عقل و فکر، استدلال اور ذہانت کا سبق دینے کے ساتھ ساتھ جذبات کی تسکین اور روحانی تشنگی کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بھی فراہم کرتا ہے، انہوں نے مزید کہا کہ قرآن سائنس کو رد نہیں کرتا بلکہ اس کی تائید و توثیق کرتا ہے اور یہ کہ اگر کہیں گاہے بگاہے ایسا شائبہ نظر بھی آجائے تو وہ سائنس کے ناقص ہونے کی دلیل ہے اور اس مخصوص شعبہ میں کام کرنے کی ضرورت ہے مگر قرآن کی آفاقی عظمت اور بزرگی بہرحال مسلم ہے"

قرآن مسافرانہ علم و تحقیق کیلئے مرکزِ توجہ

ادھر ایک سال کے عرصہ میں راقم الحروف کی نظر سے متعدد مضامین ایسے گذرے ہیں جن میں بعض غیر مسلم ڈاکٹر نے ان قرآنی آیتوں اور سورتوں کا تذکرہ کیا ہے، جن سے وہ علمی، تحقیقی، سائنسی اور طبی نقطہ نگاہ سے متأثر ہوئے ہیں، ان مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت دیدی جائے تو حق اور ہدایت کے جویا اور متلاشی کے لئے ایسی کوئی کتاب بلاشبہ

"نشانِ منزل" ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے بھی بعض قیمتی مضامین شائع ہو چکے ہیں، جو بتاتے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے جن طبی حقائق سے پردہ اٹھایا ہے، وہاں تک آج کے سائنسداں کی رسائی برسہا برس کے مطالعہ و تحقیق کے بعد ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر اسی سورۂ زمر میں چھٹی آیت ہے جس کے ایک حصہ کا ترجمہ یہ ہے "وہ (اللہ) تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں بناتا ہے۔ ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر تین تین تاریکیوں میں" اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

"جنین (پیٹ کے اندر جو بچہ ہوتا ہے) خود ایک جھلّی کے اندر رہتا ہے، جھلّی رحم کے اندر ہوتی ہے اور خود رحم شکم کے حصۂ زیریں میں چھپا ہوا ہے، یہ تین تین پردے اور تاریکیاں ہوئیں"

اس کے بعد وہ بیان کرتے ہیں:

"ضلع الٰہ آباد کے قریب رہنے والے ایک نامور و ممتاز ہندو ڈاکٹر جن کا انتقال ابھی چند سال ہوئے، ہوا ہے، خاص شہر الٰہ آباد میں مطب کرتے تھے، ان کے متعلق ایک معتبر راوی نے بیان کیا کہ وہ درپردہ مسلمان ہو گئے تھے اور قرآن کی صداقت کے قائل اسی آیت کی بنا پر ہو گئے تھے، کہتے تھے کہ ایک اُمّی عرب کے لئے اس گہری طبی حقیقت سے آج سے تیرہ چودہ سو برس پہلے واقف ہو جانا ناممکن تھا۔"

(تفسیرِ ماجدی)

ایک دوسری مثال فرانسیسی ڈاکٹر غرینیہ کی ہے جو پیرس کے ایک کامیاب پریکٹشنر ہونے کے علاوہ فرانسیسی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے، ان کا بیان ہے :-

"مجھے اکثر سمندری سفروں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے میری زندگی کا بڑا حصہ پانی اور آسمان کے درمیان بسر ہوا ہے اسی طرح کے ایک سفر میں ایک بار مجھے قرآن کا فرانسیسی ترجمہ ملا، یہ موسیو سا قاری کا ترجمہ تھا، میں نے اسے کھولا تو سورۂ نور کی ایک آیت سامنے تھی، جس میں ایک سمندری نظارے کی کیفیت بیان کی گئی ہے، اَوکظُلمٰتٍ ..... فَمَالَہٗ مِن نورٍ (سورۂ نور: ۴۰) "جیسے اندھیرا گہرے سمندر میں، اس کو ڈھانپ لیا ہو موج نے، لہر کے اوپر لہر اس کے اوپر بادل، اندھیرے پر اندھیرا، اس حالت میں ایک شخص اپنا ہاتھ نکالے تو توقع نہیں کہ وہ اس کو دیکھ سکے اور جس کو خدا نور نہ دے اس کے لئے کوئی روشنی نہیں"

میں نے اس آیت کو نہایت دلچسپی سے پڑھا، جس میں سمندری نظارے کی کیفیت بیان کی گئی تھی، جب میں نے یہ آیت پڑھی تو میرا دل تمثیل کی عمدگی اور اندازِ بیان کی واقعیت سے بے حد متأثر ہوا، میں نے خیال کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایک ایسے شخص ہوں گے جن کے رات اور دن میری طرح سمندری سفروں میں گذرے ہوں گے، پھر بھی مجھے حیرت تھی کہ انہوں نے اس راز کو کیسے پایا؟

لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد عربیؐ محض اُمی تھے، اور انہوں نے زندگی بھر کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا۔ اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہوگیا، میں نے سمجھا کہ یہ محمدؐ کی آواز نہیں بلکہ اس خدا کی آواز ہے جو رات کی تاریکی میں ہر ڈوبنے والے کی بے حاصلی کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔ ——— گمراہوں کی آوارگی اور ان کی جدوجہد کی بے حاصلی کو کیسے مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے، گویا کہ وہ سیاہ بادلوں کی تاریکی اور موجوں کے طوفان میں ایک جہاز پر کھڑے ہیں اور ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی بدحواسی کو دیکھ رہے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سمندری خطرات کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اتنے کم الفاظ میں اتنے کامیاب طور پر خطراتِ بحر کی تصویر کشی نہیں کر سکتا۔"

(ہفت روزہ الجمعیۃ ۱۰ ر تا ۱۶ ر مئی ۱۹۹۶ء)

بلاشبہ قرآن حکیم، علوم و معارف کا بے مثال اور لازوال خزینہ ہے۔ اس کا پتہ دینا اور یہاں تک پہونچانا اپنی سعادت کے ساتھ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو سب سے بہترین قرار دیا ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے، پڑھے اور پڑھائے ——— بچوں کی تفسیر قرآن کے مفسر مولانا ابو محمد مصلحؒ (ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن، حیدرآباد) نے

بڑی ہی پختہ اور دانشمندانہ بات ارشاد فرمائی ہے:

؎ غیروں کی مصلحت پستی پر اور اپنی غافل ہستی پر
کرنا ہے تمہیں احسان اگر قرآن پڑھو قرآن پڑھو

سمندر میں
خُدا کی قدرت کا کرشمہ

امریکہ کی مشہور ریاستوں میں ایک" فلوریڈا FALORIDA بھی ہے اسی ریاست میں وہ مقام (کینیڈی اسپیس سنٹر) ہے جہاں سے امریکہ کے خلا رباز نیل آرام اسٹرانگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء میں چاند پر گئے تھے، اسی کے ایک شہر" اورلنڈو" کے ملحقہ حصہ میں وہ جگہ ہے جو" ڈیزنی لینڈ کے نام سے مشہور ہے اور میلوں پھیلا ہوا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی روزانہ اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں، بلا شبہ ڈیزنی لینڈ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے اور اس میں داخل ہونے کے بعد ایک انسان بیک وقت ساری دنیا کا گشت کر لیتا ہے اور وہاں کی تہذیب و تمدن اور معاشرت سے واقف ہو جاتا ہے۔ مصنوعی طور پر خلاء اور سیاروں کی بھی بالکل اسی ماحول میں سیر کرنے والے سیر کر لیتے ہیں، اسے اگر کوئی مکمل تحقیقی طور پر دیکھنا چاہے تو اس کے لئے کم از کم ایک ہفتہ کا وقت درکار ہے۔

انسانی فن کا کمال

——— راقم الحروف کو ان مقامات کے علاوہ اس ریاست کے متعدد شہروں میں خصوصیت کے ساتھ سمندر کے ساحل پر بسا ہوا نہایت حسین و دلکش شاداب اور موسم کے اعتبار سے معتدل شہر "میامی" جانے کا بھی موقع ملا، فلوریڈا کے شہروں میں میامی میں مقیم اپنے میزبان جناب حاجی اقبال لگن اور ان کے خسر مولانا حکیم میر بہاءالدین سلیم (حیدرآباد) کے ہمراہ کار کے ذریعہ جس شہر میں بھی گیا سمندر سے گذرنا پڑا سمندر کے سینے کو چیر کر جس قدر بلند و بالا اور طویل پل بنائے گئے ہیں، ان پر سے گذرتے ہوئے خدا کی قدرت اور انسان کے ہنر و فن کو دیکھ کر ایک آدمی حیران و ششدر رہ جاتا ہے،

قرآن حکیم کی چشم کشا آیتیں

——— ایسے موقع پر قرآن حکیم کے ایک طالب علم کو وہ آیات بڑا لطف دیدیتی ہیں بلکہ چشم کشا ثابت ہوتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے سمندر کی حیثیت اور عظمت کو بیان فرمایا ہے، سورۂ لقمان کی ۲۱ ویں آیت سمندر کو دیکھنے والی نگاہوں سے پوچھتی ہیں کہ سمندر کی وسعتیں، اس کی گہرائیاں، اس میں پہاڑوں کی طرح اُٹھنے والی موجیں، قدم قدم پر حلقہ ہائے گرداب اور ان میں ایک کشتی اپنی پشت پر سینکڑوں ہزاروں انسانوں کو بٹھائے اپنے دامن میں لاکھوں ٹن سامان لئے بپھری ہوئی لہروں سے آنکھ مچولی کرتی، گردابوں سے دامن بچاتی اپنی منزل کی طرف چلی جارہی ہے۔ کیا یہ قدرت خداوند کا اعجاز نہیں ہے؟ غور کرنے سے صاف واضح ہے کہ سمندر میں بھی

آیات ربانی کا مینا بازار سجا ہوا ہے اور اس کے ایک ایک قطرہ میں کئی جہاں چھپے ہیں۔ کئی قوتیں خوابیدہ ہیں لیکن قرآن کی مذکورہ آیت بتاتی ہے کہ قدرت کے یہ جلوے صرف ان باہمت لوگوں کے لئے اپنے رخ سے نقاب اٹھاتے ہیں جو صبر کی صفت سے متصف ہیں، غور و تدبر کے خوگر ہیں، پیہم ناکامیوں سے شکستہ خاطر نہیں ہوتے بلکہ ہمت سے آگے بڑھنے کی دھن ان کو بے قرار رکھتی ہے، انہیں باہمت لوگوں پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے۔ قرآن میں اس کے لئے یہاں "صبار شکور" کے الفاظ استعمال ہوئے جو نوجوانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کیلئے تن آسانی و آرام طلبی کے گوشوں سے باہر نکال دینے کے لئے ان کو منجمد جذبات میں آتش شوق لگانے کے لئے بہت کافی ہیں، کاش مسلمان اس کتاب حکیم کی طرف ایسی توجہ کرتے جس کی وہ مستحق ہے تو آج وہ اپنی پستی پر سرد آہیں نہ بھرتے اور اغیار کی سرعت رفتار پر محو حیرت بنے کھڑے نہ ہوتے۔

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشہ می روی

ایک فرانسیسی محقق اور مصری عالم کی دلچسپ گفتگو

سمندری ماحول اور اس سے متعلق قرآنی آیات مجھے پورے طور پر اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھیں کہ اسی درمیان ایک دن ۱۹ اپریل ۱۹۹۲ء) حیدرآباد سے مشہور صاحب علم و ادیب تمکین کاظمی مرحوم (وفات ۱۹۶۱ء) کے باذوق فرزند جناب سید علی کاظمی (پیدائش ۱۹۴۷ء) سے

میامی میں ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے دوران .... سمندر کی حیثیت وعظمت کا تذکرہ آیا تو مشہور فرانسیسی ماہر سمندریات ژاک کسٹو JACK COUSTO کے بارے میں وہ بیان کرنے لگے کہ آج سے دو سال قبل وہ اپنی تحقیق کے دوران ... اپنے ساتھیوں کے ساتھ سمندر کے ایسے مقام پر پہنچے کہ جب وہاں کی مچھلیوں کو انہوں نے پانی سے نکالا تو عام سمندر کی مچھلیوں کے برعکس وہ کھاری اور نمکین نہیں تھیں بلکہ دریا اور تالاب میں پائی جانے والی مچھلیوں کی طرح میٹھی تھیں، انہیں سخت تعجب ہوا کہ ایسا کیوں ہے؟ تحقیق اور جستجو سے معلوم ہوا کہ سمندر کے جس حصہ سے انہوں نے مچھلیاں نکالی ہیں اس حصہ میں فلاں دریا کا پانی گرتا ہے اور بہت دور تک طول وعرض میں وہ پھیلا ہوا ہے۔ سمندر کے پانی میں ملنے کے باوجود دریا کے پانی نے اپنی مٹھاس کو باقی رکھا ہے۔ دونوں پانی کے درمیان بہ ظاہر کوئی حجاب نہیں ہے مگر اس کے ایک کنارے سے جو سمندر کا ہے پانی لیا جائے تو کھارا اور نمکین ہے اور اسی جگہ دوسرے حصے سے جو دریا کا ہے پانی لیا جائے تو شیریں اور میٹھا ہے۔ انہوں نے جن مچھلیوں کا شکار کیا ہے وہ دراصل دریا سے آنے والے پانی کے علاقے کی تھیں اس لئے کھاری کی بجائے میٹھی تھیں۔

ژاک کسٹو نے اپنی اس تحقیق کو "حیرت انگیز انکشاف" قرار دیتے ہوئے مصر کے ایک صاحب علم سے بیان کیا، مصری عالم نے کہا کہ ممکن ہے یہ تحقیق آپ کے لئے حیرت انگیز ہو مگر قرآن کی دنیا کے لئے یہ قطعاً حیرت انگیز نہیں ہے۔ قرآن میں متعدد آیتیں ایسی ہیں جن کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جسے آپ نے اپنے سمندری سفر میں دریافت

کیا ہے، کاظمی صاحب کے بیان کے مطابق جب مصری عالم نے تفصیل سے ان قرآنی آیتوں کی تشریح کی تو بہت متأثر ہوئے اور ایک اطلاع کے بموجب وہ مسلمان ہو گئے۔ اس[1] وقت وہ تقریباً گیارہ مہینے سمندر میں سمندری مخلوقات اور اشیاء کی تحقیق میں گذارتے ہیں اور صرف ایک مہینہ خشکی میں رہتے ہیں۔ امریکہ کے ٹی وی پروگرام میں چانل گیارہ پر ان کی سمندری دریافت اور تحقیقات پیش کی جاتی ہیں۔ جنہیں اہلِ ذوق بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

میٹھا اور نمکین پانی، چند قرآنی آیتیں

فرانسیسی محقق مسٹر ژاک کسٹو کے سامنے مصری عالم نے سورۂ فرقان کی ایک آیت کے علاوہ جن قرآنی آیتوں کو پیش کیا ان کا مطالعہ قرآنی اور معلوماتی ذوق و ذہن رکھنے والے لوگوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ پہلے ان آیتوں کا ترجمہ سامنے رکھ لیا جائے اس کے بعد تفسیری نوٹ پیش کیا جائے گا۔

سورۂ فرقان میں ہے" اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ملا دیا ہے دو دریاؤں کو، یہ (ایک) بہت شیریں ہے اور یہ دوسرا سخت کھارا بنا دیا ہے" اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کے درمیان آڑ اور مضبوط رکاوٹ کھڑی کر دی ہے" (آیت ۵۳) سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا ہے" اور یکساں نہیں ہو سکتے پانی کے دو ذخیرے یہ (ایک) میٹھا ہے بہت شیریں اس کا پینا بڑا خوشگوار ہے اور یہ دوسرا سخت نمکین کھاری تلخ،، (آیت ۲) سورۂ رحمٰن کی مشہور آیت" اسی نے دو دریاؤں کو ملایا کہ باہم ملے ہوئے بھی ہیں اور دونوں کے

---

[1] آج سے تقریباً دس بارہ سال قبل حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی مدظلہ نے امریکہ کا سفر کیا تھا، یہ مضمون اسی وقت کا تحریر کردہ ہے ——— عبدالباسط ۱؍۳؍۲۲۲اھ۔

درمیان ایک حجاب بھی ہے کہ دونوں آگے بڑھ نہیں سکتے۔ (آیت ۱۹۔۲۰)

تشریح و تفہیم

اردو تراجم میں عام طور پر البحرین کا معنی دو سمندر یا دو دریا کیا گیا ہے حالانکہ سمندر سارے کھارے ہیں کوئی میٹھا نہیں اور دریاؤں کا پانی میٹھا ہوتا ہے کھارا نہیں ہوتا۔ اس لئے جب تک لفظ بحر کی لغوی تحقیق نہ کی جائے یہ الجھن دور نہیں ہوتی۔ علامہ ابن منظورؒ نے اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "البحر الماء الکثیر ملحًا او عذبًا"۔ یعنی پانی کی کثیر مقدار اور وسیع ذخیرہ کو بحر کہتے ہیں، خواہ وہ نمکین ہو یا شیریں۔ بحر کو بحر کہنے کی وجہ انہوں نے یہ لکھی ہے کہ اس میں وسعت اور انبساط کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے کوئی شخص بہت سخی ہو تو اسے کہتے ہیں" اِنّہ البحر" کہ وہ تو بحر ہے۔ یہ درست ہے کہ عام طور پر بحر کا اطلاق سمندر پر ہوتا ہے لیکن میٹھے پانی کے وسیع ذخیرہ کو بھی اہلِ عرب بحر کہتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن منظور نے ابن مقبل کا ایک شعر بطور استشہاد پیش کیا ہے۔ اس لغوی تحقیق کے بعد مذکورہ آیات کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ پانی دو قسم کے ہیں، میٹھا خوش ذائقہ اور تلخ و نمکین لیکن ہر پانی اپنی اپنی جگہ پر قائم ہے، ان کو الگ الگ رکھنے کے لئے قدرت نے رکاوٹیں قائم کر دی ہیں تاکہ یہ باہم مل نہ سکیں یہ رکاوٹیں کبھی تو اتنی لطیف اور غیر محسوس ہوتی ہیں کہ انسان دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے، بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک جگہ نلکا لگایا گیا تو پانی میٹھا نکلا پھر چند فٹ کے فاصلے پر دوسرا نلکا لگایا گیا تو پانی کھارا نکلا بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دیوار کے اندر والا پانی میٹھا اور باہر والا کھاری، اس

سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ سمندر میں جب مد ہوتا ہے تو سمندر کا آبِ شور دور تک خشکی کے دریاؤں ندی نالوں میں داخل ہو جاتا ہے اور ان دریاؤں کا میٹھا پانی حسبِ سابق رواں رہتا ہے اور اس کے ذائقہ میں بھی کوئی فرق نہیں رہتا۔ دریائے نیل جب بحرِ روم میں جاکر گرتا ہے تو کئی میل تک اس کا پانی سمندر میں جوں کا توں چلا جاتا ہے، نہ اس کی رنگت بدلتی ہے اور نہ اس کا ذائقہ تبدیل ہوتا ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ کھارے کڑوے سمندر کے وسط میں پانی کے ایسے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں جن کا پانی بالکل میٹھا ہوتا ہے، جیسا کہ بحرِ محیط میں اس کی وضاحت ہے۔ اس کی تصدیق تفہیم القرآن کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی ہوتی ہے :۔

"ترکی امیرالبحر سید علی رئیس (کاتب رومی) اپنی کتاب 'مراۃ الممالک' میں جو سولہویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لیے پانی پینے کا حاصل کرتا رہا ہوں" موجودہ زمانہ میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداء میں وہ بھی خلیج فارس کے انہیں چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی، بعد میں ظہران کے پاس کنوئیں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا گیا۔"

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۴۵۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سورۂ رحمٰن کی مذکورہ آیات (۲۰،

۱۹) کے ذیل میں لکھتے ہیں "ماہرین فن کا بیان ہے کہ سطح زمین کے نیچے پانی کے دو مستقل نظام جاری ہیں۔ ایک سلسلہ آب شور کا ہے جو سمندروں سے ظاہر ہوتا ہے دوسرا سلسلہ آب شیریں کا ہے جو عموماً کنوئیں۔ دریاؤں، جھیلوں سے نکلتا رہتا ہے۔ کائنات انسانی کے واسطے دونوں اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری ہیں، آیت میں اس حکمت و صنعت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دونوں نظام پوری طرح قائم بھی ہیں اور پھر ایک دوسرے سے گڈمڈ اور مدغم نہیں ہو پاتے۔"

(تفسیر ماجدی)

مولانا اشرف علی تھانویؒ سورۂ فرقان کی آیت ۵۳ کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "مراد ان دو دریاؤں سے وہ مواقع ہیں جہاں شیریں ندیاں اور نہریں بہتے بہتے سمندر میں آکر گرتی ہیں وہاں باوجود اس کے کہ اوپر سے دونوں کی سطح ایک معلوم ہوتی ہے لیکن قدرت الٰہیہ سے ان میں ایک حد فاصل ہے کہ ملتقی (سنگم) کے ایک جانب سے پانی لیا جائے تو شیرین ہے اور دوسری جانب سے جو کہ جانب اول کے بالکل قریب ہے پانی لیا جائے تو تلخ۔" (بیان القرآن)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ میٹھا اور نمکین پانی کی خلقت پر فاضلانہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل اور حکمت بالغہ سے دنیا میں دو طرح کے دریا پیدا فرمائے ہیں۔ ایک سب سے بڑا بحر محیط جس کو سمندر کہتے ہیں اور زمین کے سب اطراف اس میں گھرے ہوئے ہیں، ایک چوتھائی کے قریب حصہ ہے جو اس سے کھلا ہوا ہے اس میں ساری دنیا آباد ہے یہ سب سے بڑا دریا بتقاضائے

حکمت سخت نمکین تلخ اور بدمزہ ہے۔ زمین کے آباد حصہ پر آسمان سے
اتارے ہوئے پانی کے چشمے، ندیاں، نہریں اور بڑے بڑے دریا
ہیں، یہ سب میٹھے خوش گوار اور خوش ذائقہ ہیں۔ انسان کو پینے اور
پیاس بجھانے اور روزمرہ کے استعمال میں ایسے شیریں پانی کی ضرورت
ہے جو حق تعالیٰ نے زمین کے آباد حصہ میں مختلف صورتوں میں مہیا فرمادیا
ہے لیکن بحر محیط سمندر اگر میٹھا ہوتا تو میٹھے پانی کا خاصہ ہے کہ بہت جلد
سڑ جاتا ہے۔ خصوصاً سمندر جس میں خشکی کی آبادی سے زیادہ دریائی
حیوانوں اور جانوروں کی آبادی بھی ہے جو اس میں مرتے ہیں وہیں سڑتے
اور مٹی ہو جاتے ہیں اور پوری زمین کے پانی اور اس میں بہنے والی
ساری گندگیاں بھی بالآخر سمندر میں جاکر پڑتی ہیں اگر یہ پانی میٹھا
ہوتا تو دو چار دن میں ہی سڑ جاتا اور یہ سڑتا تو اس کی بدبو سے زمین
والوں کو زمین پر رہنا مصیبت ہو جاتا۔ اس لئے حکمت خداوندی نے
اس کو اتنا سخت نمکین اور کڑوا اور تیز بنادیا کہ دنیا بھر کی گندگیاں اس
میں جاکر بھسم ہو جاتی ہیں اور خود اس میں رہنے والی مخلوق بھی جو اس
میں مرتی ہے وہ بھی سڑنے نہیں پاتی۔

آیت مذکورہ الفرقان ۵۳ میں ایک تو اس انعام و احسان کا
ذکر ہے کہ انسان کی ضرورت کا لحاظ فرماکر دو قسم کے دریا پیدا فرمائے
دوسرے اس قدرت کاملہ کا کہ جس جگہ میٹھے پانی کا دریا یا نہر سمندر میں
جاکر گرتے ہیں اور میٹھا اور کڑوا دونوں پانی یکجا ہو جاتے ہیں وہاں یہ
مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دونوں پانی میلوں دور تک اس طرح ساتھ لگے
ہوئے چلتے ہیں کہ ایک طرف میٹھا، دوسری طرف کڑوا اور ایک دوسرے

سے نہیں ملتے، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کوئی آڑ حائل نہیں ہوتی"
(معارف القرآن جلد ۶ صفحہ ۴۸۶)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ نے ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے حاشیہ پر اپنے فوائد القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ "بیان القرآن میں دو معتبر بنگالی علماء کی شہادت نقل کی ہے کہ ارکان سے چاٹگام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبیں بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں ایک کا پانی سفید ہے، ایک کا سیاہ۔ سیاہ میں سمندر کی طرح طوفانی تلاطم اور تموج ہوتا ہے اور سفید بالکل ساکن رہتا ہے، کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے بیچ میں ایک کھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقی ہے لوگ کہتے ہیں کہ سفید پانی میٹھا ہے اور سیاہ کڑوا، اور مجھ سے باریسال کے بعض طلبہ نے بیان کیا ہے کہ ضلع باریسال میں دو ندیاں (بلشر اور ...) ایک ہی دریا سے نکلی ہیں، ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔ راقم الحروف (مولانا عثمانیؒ) جس جگہ آج کل مقیم ہے (ڈابھیل سملک ضلع سورت گجرات) سمندر تقریباً دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے ادھر کی ندیوں میں بار بار مدوجزر (جوار بھاٹا) ہوتا رہتا ہے، بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے، اوپر کھاری رہتا ہے نیچے میٹھا، جزر کے وقت اوپر سے کھاری اتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے۔"
(فوائد القرآن ص ۴۸۲ مطبوعہ مغربی جرمنی)

بعض مفسرین نے سورۂ فرقان آیت ۵۳ کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ

میٹھے پانی سے مراد حق ہے اور کڑوے کھارے پانی سے مراد باطل ہے اپنی ساری کثرت اور شوکت کے باوجود حق کو مٹا نہیں سکتا، گمراہی کے گھپ اندھیروں میں بھی ہدایت کے چراغ ضرور فروزاں رہیں گے، ان طوفانوں اور اندھیروں کے باوجود حق کا علم لہراتا ہی رہے گا۔ اس طرح بعض صوفیہ نے اس نظیر سے فائدہ اٹھا کر معنوی حیثیت سے بھی دو بحر قرار دیئے ہیں، ایک بحر روح موصوف بصفات حمیدہ۔ دوسرا بحر نفس موصوف بصفات ذمیمہ اور کہا ہے کہ سطحی طور پر دونوں ایک دوسرے سے ملتبس و مختلط معلوم ہوتے ہیں مگر واقع میں دونوں میں امتیاز ہے جسے مبصر معلوم کرلیتا ہے۔" (تفسیر ماجدی)

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں

بلاشبہ کائنات میں خلق کائنات کی بے شمار عجیب وغریب نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، قرآن جن کے عجائب وغرائب کبھی ختم نہیں ہونگے وہ ان عجیب وغریب نشانیوں کی نشاندہی کرتا ہے، بڑے ہی باحوصلہ اور سعادتمند ہیں وہ لوگ جو نشانیوں سے اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کرتے ہیں، یہی وہ معرفت ہے جو انسان کو شک اور تذبذب کے دلدل سے نکال کر ایمان ویقین کی منزل سے آشنا کرتی ہے اور ایسے لوگ خدائے لم یزل ولایزال کی محکم اور بصیرت وحکمت سے لبریز کتاب قرآن میں اپنے ہر سوال کا اصولی جواب پالیتے ہیں۔ اس لئے عاشقِ کتابِ الٰہی شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا ہے:۔

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ؛ اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

✲✲✲

مؤمن کی معاشی زندگی

تین بنیادی اصولؑ

"اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کے نماز کے لئے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو" (جمعہ ۹)

پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین پر چلو پھرو، اور اللہ کی روزی تلاش کرو، اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (جمعہ ۱۰)

اور (بعض کا حال یہ ہے کہ) جب سودا بکتا ہوا اور تماشہ ہوتا دیکھتے ہیں تو اس طرف چلے جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ جو چیز اللہ کے پاس ہے وہ تماشہ اور سودے سے کہیں بہتر ہے، اور اللہ سب سے اچھا روزی پہونچانے والا ہے"۔ (جمعہ ۱۱)

آپ نے جو ابھی پڑھا یہ سورۂ جمعہ کی آخری تین آیتوں کا ترجمہ ہے، ان تین آیتوں پر غور کرنے سے مؤمن کی معاشی زندگی کے سلسلہ میں تین بنیادی اصول سامنے آتے ہیں، ان اصولوں کے ذکر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع کا ذکر کیا جائے جس موقع سے یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

جمعہ کا دن تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ (جو اس وقت عیدین کی طرح بعد نمازِ جمعہ ہوتا تھا) دے رہے تھے، اتنے میں ایک تجارتی قافلہ دحیہ بن خلیفۃ الکلبی کی سرکردگی میں شام سے غلہ لے کر آیا، معمول کے مطابق قافلہ والے لوگوں کی اطلاع کے لئے دف بجا رہے تھے۔

دف کی آواز ان حضراتِ صحابہ تک بھی پہونچی جو بیٹھے آپؐ کا خطبہ سن رہے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب مدینہ منورہ میں سخت قحط تھا اور مقامی بازار میں غذائی اشیار نایاب تھیں، چنانچہ غذائی ضرورت کے تحت بعض وہ صحابہؓ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور شریعت کے احکام و قوانین ابھی ان میں پوری طرح راسخ نہیں ہوئے تھے، یہ سوچ کر دورانِ خطبہ قافلہ کی طرف چل پڑے کہ نماز تو ختم ہی ہو چکی ہے، خطبہ کا حکم عام وعظوں کی طرح ہے جس میں ضرورت کے لئے اٹھ سکتے ہیں۔

جب یہ حضرات جا چکے تو آپ نے دریافت فرمایا "اب کتنے لوگ رہ گئے ہیں" جواب دیا گیا! بارہ مرد اور ایک عورت، اس پر آپ نے تادیباً فرمایا کہ اگر یہ سب لوگ بھی چلے گئے ہوتے، اور یہاں کوئی نہ ٹھہرتا تو ان کے اوپر آسمان سے پتھر برستے اور مدینہ کی زمین آگ کی زمین بن جاتی۔ (اسباب النزول للشیخ الامام ابی الحسن علی النیساپوری ص۳۲۰)

یہ ہے وہ پسِ منظر جس میں مندرجہ بالا آیتیں نازل ہوئیں جن میں دورانِ خطبہ اٹھ جانے والے صحابہ کی خطار اجتہادی پہ تنبیہ فرماتے اور تلاشِ معاش کا حکم دیتے ہوئے اِس سلسلہ میں بنیادی طور

پر تین اصول بیان کئے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں :

(۱) دینی تقاضے کو معاشی تقاضے پر ترجیح ۔

(۲) معاشی مصروفیت کے دوران خدا کا خوف اور اس کا ذکر ،

(۳) مادی منافع اور عارضی لذت کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کی رحمت اور اخروی انعام کی بہتری اور برتری کا احساس ۔

اب ان تینوں کی مختصر تشریح علی الترتیب ملاحظہ فرمائیے :

پہلا اصول

(۱) جب کبھی ایسا موقع آئے کہ ایک طرف معاشی تقاضے ہوں دوسری طرف دینی تقاضے تو ایک مؤمن کو چاہیے کہ معاشی تقاضے کو چھوڑ کر دینی تقاضے کی طرف دوڑ پڑے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو ۔

اگر اس نے اس حکم کی پابندی کر لی تو دنیوی و اخروی دونوں اعتبار سے "خیر" کا مالک ہوگا ، دنیوی اعتبار سے یوں کہ کسی خدائی پکار کی طرف جب سب کے قدم بیک وقت اٹھیں گے تو اس سے "تنظیمِ امت" کا مظاہرہ ہوگا جس سے ظاہری طور پر دوسرے لوگوں پر رعب اور دبدبہ قائم ہوگا اور انہیں ایسی منظم اور متحد قوم کو چھیڑنے کی ہمت نہیں ہوگی ۔ اور اخروی اعتبار سے یوں کہ آخرت کا نفع باقی ، دنیا کے ہر نفعِ فانی سے کہیں زیادہ بیش بہا اور قیمتی ہے ۔

آیت کے اس ٹکڑے میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے ،

ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے

اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

اس کے برعکس جو معاشی تقاضے کو دینی تقاضے پر ترجیح دیگا۔ اس کے حصہ میں سوائے گھاٹے اور نقصان کے کچھ نہیں جیسا کہ سورۂ منافقون کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے :

"اے ایمان والو! کہیں تمہارے مال اور تمہاری اولادُ تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں، اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہی لوگ تو گھاٹے میں رہنے والے ہیں" (آیت : ۹)

سورۂ طٰہٰ میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے :

"اور جو شخص میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا" (آیت : ۱۲۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی بڑی دلنشیں تشریح فرمائی ہے، لکھتے ہیں :

"جو آدمی اللہ رب العزت کی یاد سے غافل ہو کر محض دنیا ہی کی زندگی کو "قبلہ مقصود" سمجھ بیٹھے ہیں، اس کی گذران مکدر اور تنگ کر دی جاتی ہے، گویا دیکھنے میں بہت کچھ اس کے پاس مال و دولت اور سامانِ عیش و عشرت نظر آئے مگر اس کا دل قناعت و توکل سے خالی ہونے کی بنا پر مزید حرصِ ترقی کی فکر اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے، کسی وقت ننانوے کے پھیرے سے قدم باہر نہیں نکلتا، موت کا یقین اور زوالِ دولت کے خطرات الگ سوہانِ روح بنے رہتے ہیں"

مثال پیش کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں :

"یورپ کے اکثر متنعین کو دیکھ لیجئے کسی کو رات دن میں
دو گھنٹے اور کسی خوش قسمت کو چار گھنٹے سونا نصیب
ہوتا ہوگا، بڑے بڑے کروڑپتی دنیا کے مخمصوں سے
تنگ آکر موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں اور اس
نوع کی خودکشی کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں"

آگے مولانا صدائے عام دیتے ہیں :

"نصوص اور تجربہ اس پر شاہد ہے کہ اس دنیا میں قلبی
سکون اور حقیقی اطمینان کسی کو بدون یاد الٰہی کے حاصل
نہیں ہوسکتا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب ،
ع، ذوق ایں بادہ ندانی تا بخدا نہ چشی"

دیکھ لیا آپ نے کہ بدون یادِ الٰہی اور دینی تقاضے کی تکمیل کے انسانی زندگی اور اس کی معیشت کس قدر اس کے لئے تکلیف دہ اور سوہانِ روح کا باعث بن جاتی ہے۔

اب ذرا دیکھئے کہ شانِ نزول میں جو واقعہ مذکور ہوا ہے اس پر جب اللہ رب العزت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ وتادیب فرمائی تو اس کے بعد ان کی کیا حالت تھی؟ اسکے لئے سورۂ نور کی یہ آیت پڑھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ سبّوح قدّوس نے ان نفوسِ قدسی کی کس شان سے تعریف بیان فرمائی ہے۔

ارشاد ہے :

"وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو تجارت اور خرید وفروخت

اللہ کے ذکر اور بالخصوص نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے
سے غافل نہیں کرتی" (آیت: ۳۷)

تشریح مقصود ہو تو ایک مؤرخ اسلام کا درج ذیل بیان پڑھیئے:

"اذان کی آواز ان کے بازاروں میں سناٹا ڈال دیتی
تھی۔ فوراً دکانیں بند کر کے خرید و فروخت کو چھوڑ کر مسجد
کی طرف دوڑ پڑتے۔ اگر ان میں کا کوئی لوہار ہتھوڑا اوپر
اٹھائے ہوئے کسی لوہے پر مارنا چاہتا مگر درمیان میں
اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو اسی وقت ہتھوڑے کو
ہاتھ سے رکھ کر خدا کے گھر کی طرف چل پڑتا اور وہ اسے
بھی گوارا نہ کرتا کہ اٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے
کام لے لے"

اللہ اللہ! ان کی زندگی میں دینی تقاضے کی فوری تعمیل کا کس درجہ اہتمام تھا کہ اذان کے بعد انہیں یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ حصولِ معاش کے لئے اٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لے لیں۔

ع: خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بے موقع نہیں ہوگا اگر اس موقع پر سورۃ نور کی مذکورہ آیت میں جو "اقامتِ صلوٰۃ" کا لفظ آیا ہے اس کی تشریح کر دی جائے۔

سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ صیغے کے اختلاف کے ساتھ قرآن مجید میں بہت سارے مقامات پر آیا ہے، لیکن اس کے صحیح معنی سے کم ہی لوگ واقف ہیں، لفظی معنی تو نماز قائم کرنا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے وہی نماز دراصل قائم کی ہوئی ہوتی ہے جو ٹھیک وقت پر جماعت کیساتھ

پڑھی گئی ہو، ٹھہر ٹھہر کر اور باقاعدگی کے ساتھ ادا کی گئی ہو جس کی قرأت میں ترتیل اور توجہ الی اللہ کا پورا خیال کیا گیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ نماز کے ظاہری و باطنی حقوق و آداب کی پوری رعایت کی گئی ہو۔ اب اگر کوئی شخص معاشی دھندوں کے پیچھے پڑ کر نماز نہیں پڑھتا یا پڑھتا ہے مگر جماعت۔ وقت اور اس قسم کے دیگر شرائط اور حقوق و آداب کی رعایت نہیں کرتا تو وہ شخص نماز کو قائم کرنے والا نہیں بلکہ اسے "ضائع کرنے والا ہے جیسا کہ سورۂ مریم میں ارشاد ہے:

"پھر ان (انبیاء) کے بعد بعض ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کی پیروی کی سو عنقریب یہ خرابی سے دوچار ہوں گے" (آیت: ۵۹)

دوسرا اصول

(۲) جب مؤمن حصولِ معاش میں مشغول ہو تو ایسا نہ ہو کہ اسی میں گم ہو کر رہ گیا ہو بلکہ اس کے ساتھ خدا کا بھی ذکر کرتا رہے جس سے یہ معلوم ہو کہ اگرچہ وہ ظاہری طور پر معاشی دھندے میں مصروف ہے مگر اس کی توجہ ہر آن خدا تعالیٰ کی طرف لگی ہوئی ہے۔

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

اور اللہ کی روزی تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔

مومن کا یہ ذکر زبان سے بھی ہو اور عمل سے بھی، زبان سے اس طرح کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، تکبیر و تہلیل اور تسبیح و تحمید کے کلمات با

بار زبان سے نکل رہے ہوں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بازار میں داخل ہوتے ہوئے بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ خَیْرَ ھٰذِہِ السُّوْقِ وَخَیْرَ مَا فِیْھَا وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ مَا فِیْھَا اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُصِیْبَ فِیْھَا یَمِیْنًا فَاجِرَۃً وَصَفْقَۃً فَاجِرَۃً پڑھا جائے اور بازار میں رہتے ہوئے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ وَبِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ کا ورد کیا جائے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کلمہ کے ورد میں بڑا اجر و ثواب ہے، اور بعض وہ صحابہ جو اجر و ثواب کے حاصل کرنے میں بہت زیادہ حریص تھے وہ بازار صرف اس کلمہ کو پڑھنے کی نیت سے جایا کرتے تھے۔

اور عمل سے اس طرح کہ وہ اپنے معاشی مشغلہ میں پورے طور پر احکامِ الٰہی کا پابند ہو، چوری، ڈاکہ، رشوت، سود، جوا (اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ) شراب، مردار، خنزیر، کتا اور اس طرح کے تمام وہ ذرائع جن میں عقلی، اخلاقی اور اجتماعی مضرتیں ہوں اور انسان کی نوعی مساوات اور فطری حقوق کو نقصان پہونچتا ہو، ان سے حاصل کردہ آمدنی کو حرام سمجھے، جائز اور حلال پیشے کو اختیار کرتے ہوئے جھوٹ، دغا اور فریب سے دور رہے، صداقت، دیانت اور امانت جیسے پاکیزہ اوصاف کو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خبر کے بموجب اپنائے رہے کہ

"راست گو تاجر قیامت کے دن انبیاء اور شہداء کے

زمرے میں ہوں گے ۔

تیسرا اصول

معاش کی اہمیت ۔ دنیا کی چمک دمک اور کھیل تماشہ اور
عارضی نفع ولذت مومن کو اس دھوکہ میں نہ ڈال دے کہ یہی سب سے
بڑی چیز ہے، یا یہی زندگی کا اصل مسئلہ ہے جس کے پیش نظر وہ ہمہ تن
اس میں اس طرح مصروف ہو جائے کہ لَامَوْجُوْدُ اِلَّا الْبَطْن

ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست ۔

ے ساقی ہے کہ ایک تبسم گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

اور EAT AND DRINK AND BE MARRY (کھاؤ، پیو اور مست رہو) کا
نعرہ لگائے ، اسی طرح معاشی ناکامی اسے اس احساس میں مبتلا کر دے
کہ ہم تو بالکل لٹ گئے اور اب ہمارے لئے اس دنیا میں کچھ نہیں رہا
اور معاشی کامیابی اس کے اندر یہ غرہ پیدا کر دے کہ ہمیں جو کچھ پانا تھا
پالیا، بلکہ وہ خدا کی رحمت اور اس کے اخروی انعام ہی کو اصل اور
سب سے بڑی چیز سمجھے ، اسی پر اپنی ناکامی اور کامیابی کا انحصار کرے
علمار اور صلحار کی صحبت اور مجالس ذکر وعبادت میں شرکت کا اہتمام
کرے ، نفعِ باقی کو نفعِ فانی پر ترجیح دے، وہ یہ خیال کرے کہ روزی
اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ، وہ بہترین روزی دینے والا ہے ، اس
مالک کے غلام کو اس کا اندیشہ نہیں چاہیئے اور اپنی سی کوشش کے
بعد پورا بھروسہ اسی پر ہو۔ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّھْوِ وَمِنَ

التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ. آپ کہہ دیجئے کہ جو چیز اللہ کے پاس ہے وہ تماشہ اور سودے سے کہیں بہتر ہے، اور اللہ سب سے اچھا روزی پہونچانے والا ہے۔

مومن کی معاشی زندگی کے یہ تین بنیادی اور رہنما اصول ہیں جن کا پاس اور لحاظ ازبس ضروری ہے ورنہ سمجھا جائے گا کہ وہ خود تو مسلمان ہے مگر اس کی معاشی زندگی مسلمان نہیں۔

حضرت عراکؓ بن مالکؓ کی معنیٰ خیز دُعا

سورۂ جمعہ کی آخری تین آیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر مومن کی معاشی زندگی کے سلسلہ میں یہ تین بنیادی اصول تحریر کئے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس پر بھی نظر رکھئے کہ حضرت عراک بن مالک رضی اللہ عنہ جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر باہر آتے تو دروازۂ مسجد پر کھڑے ہو کر یہ دعا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَجَبْتُ دَعْوَتَكَ وَصَلَّيْتُ فَرِيْضَتَكَ وَانْتَشَرْتُ كَمَا اَمَرْتَنِیْ فَارْزُقْنِیْ مِنْ فَضْلِكَ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ. (ابن کثیر)

"اے اللہ! نمازِ جمعہ کے سلسلہ میں آپ کے مقرر کردہ فرض کو ادا کیا، اب آپ کے حکم کے مطابق نماز پڑھنے کے بعد باہر جا رہا ہوں، آپ اپنے فضل سے مجھے رزق عطا فرمائیے، آپ تو سب سے بہتر رزق عطا فرمانے والے ہیں۔"

حضرت عراک بن مالکؓ کی یہ دعا نہایت معنیٰ خیز ہے، یہ دعا ایک مومن کے مومنانہ جذبات اور فکر و تصور کی آئینہ دار ہے اور یہ بتاتی ہے کہ مومن اپنی عبادتی مشغولیت اور معاشی جدوجہد دونوں تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے دونوں کو اپنے اپنے مقام پر کس معتدلانہ نظام کے ساتھ رکھتا ہے۔

نمازجمعہ کے بعد تجارت

تفسیر ابن کثیر میں بعض اسلاف اور بزرگانِ دین کے حوالے سے یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ "جو شخص نمازِ جمعہ کے بعد تجارتی کاروبار کرتا ہے اللہ تعالےٰ اس کے لئے ستّر مرتبہ برکات نازل فرماتے ہیں":

اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تجارتی کاروبار کے افتتاح، اور آغاز کے لئے نمازِ جمعہ کے بعد کا وقت سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔

مومن۔۔۔معاشی جدوجہد اور کسبِ حلال

دینی و دنیوی جدوجہد کے سلسلہ میں اسلام کا معتدل اور متوازن نظریہ ہے، اس سے دنیا کے عام لوگ تو غافل ہی ہیں، مگر بہت سے مسلمان بھی اس معاملہ میں افراط و تفریط کے شکار ہیں، جب کہ قرآنِ حکیم کی مختلف آیتوں کے ساتھ سورۃ المزمل کی آیت (۲۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں رزقِ حلال کے لئے جدوجہد کا مقام بڑا اونچا ہے کہ اس کو مجاہدین کے ساتھ شمار کیا گیا ہے، علامہ قرطبیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

سوّى الله تعالىٰ فى هذه الأية بين درجة المجاهدين والمكتسبين المال الحلال للنفقة على نفسه وعياله والاحسان والافضال وكان هذا دليلا على ان كسب المال بمنزلة الجهاد۔

"اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اور ایسے لوگ جو اپنے لئے، اپنے اہل و عیال کے لئے اور صدقہ و خیرات دینے کے لئے رزقِ حلال کے حصول میں مصروف رہتے ہیں، دونوں کے درجہ کو برابر کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسبِ حلال بھی

ایک طرح کا جہاد ہی ہے۔"

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا، صحابہؓ نے دیکھا کہ وہ رزق کے حصول میں بہت متحرک ہے، اور پوری دلچسپی لے رہا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! اگر اس کی دوڑ دھوپ اور دلچسپی اللہ کی راہ میں ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا: "اگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو یہ اللہ کی راہ ہی میں شمار ہوگی اور اگر بوڑھے والدین کی پرورش کے لئے کوشش کر رہا ہے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہی شمار ہوگی، اور اگر اپنی ذات کے لئے کوشش کر رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچا رہے تو یہ کوشش بھی فی سبیل اللہ شمار ہوگی۔ البتہ اگر اس کی یہ محنت زیادہ مال حاصل کر کے لوگوں پر برتری جتانے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے ہے تو یہ ساری محنت شیطان کی راہ میں شمار ہوگی۔" (الترغیب والترہیب)

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ مومن کی پوری زندگی عبادت ہے، اور اس کا ہر کام دائرہ شریعت میں ہو تو باعثِ اجر و ثواب ہے۔ اسلام میں زہد و تقویٰ اور عبادت کا جو وسیع تصور ہے، وہ اس حدیث سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے: "مَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَاَهْلِهٖ وَوَلَدِهٖ وَخَادِمِهٖ فَهُوَ صَدَقَةٌ" (الترغیب والترہیب)

ایک مومن اپنی ذات پر، اپنی بیوی پر، اپنے بچوں پر اور اپنے خادموں اور ملازموں پر جو کچھ خرچ کرتا ہے، وہ سب صدقہ اور عبادت ہے، جس پر اسے اجر ملے گا۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے لوگو! اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے رہنا اور روزی کی تلاش میں غلط طریقہ مت اختیار کرنا، اس لئے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مر سکتا، جب تک کہ اسے پورا رزق نہ مل جائے، اگرچہ اس کے ملنے میں کچھ تاخیر ہو سکتی ہے، تو دیکھو اللہ سے ڈرتے رہنا اور روزی کی تلاش میں اچھا طریقہ اختیار کرنا، حلال روزی حاصل کرو اور حرام روزی کے قریب نہ جاؤ۔" (ابن ماجہ)

سورہ جمعہ کی آخری تین آیتوں کی روشنی میں مومن کی معاشی زندگی کے لئے جو تین بنیادی اصول ہو سکتے ہیں، ان کے ذکر کے بعد بعض باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر بھی بطورِ خاص نظر رکھی جائے، تاکہ اسلام کے تصورِ عبادت اور نظریۂ معیشت میں جو باہمی ربط ہے، اس کی اہمیت کو سمجھا جا سکے۔

دربار نبوی میں
ایک سائل کی حاضری

ایک دفعہ، ایک غریب انصاری صحابیؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سائل کی حیثیت سے حاضر ہوئے اور انہوں نے کچھ مدد کی خواہش کی۔ آپؐ نے جب ان پر نظر ڈالی تو اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ نہ تو اپاہج ہیں، نہ ضعیف و ناتواں نہ ہی ان میں کوئی پیدائشی کمزوری ہے، پاؤں میں چلنے پھرنے کی طاقت بھی ہے اور بازو میں محنت و مزدوری کی قوت بھی، کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے افلاس و غربت کے شکنجہ میں پھنس گئے ہیں اور یہی معاشی مجبوری اور معذوری یہاں میرے پاس کھینچ لائی ہے، کیوں نہ انہیں کسی "ذریعہ" سے لگا دیا جائے تاکہ یہ "دستِ سوال" کی ذلت سے محفوظ رہ کر "عزت کی روٹی" کھا سکیں۔ "تمہارے پاس کوئی چھوٹی موٹی چیز بھی ہے"؟ دل میں یہ خیال لئے اور خاکہ بنائے ہوئے آپؐ نے "سائل صحابیؓ" سے سوال کیا ——— "جی ہاں، ایک کمبل ہے جسے بچھاتا بھی ہوں اور اوڑھتا بھی ہوں، دوسرے پانی پینے کا پیالہ اور بس" انہوں نے جواب دیا۔

"وہ دونوں لے آؤ" آپؐ نے فرمایا، تعمیل حکم میں انہوں نے دونوں چیزیں پیش کر دیں، ـــــــ "کوئی ہے جو ان چیزوں کو خریدے"؟ آپؐ نے دونوں چیزوں کو ہاتھ میں لے کر یوں آواز لگائی جیسے نیلام (ہراج) کرنے والے لگاتے ہیں، ـــــــ "میں خریدتا ہوں ایک درہم میں" مجمع میں سے ایک نے آواز دی، ـــــــ "کوئی اور ہے جو اس سے زیادہ میں خرید سکے"؟ آپؐ نے دوبارہ فرمایا، ـــــــ "میں دو درہم میں خریدتا ہوں" کسی دوسرے نے دام بڑھا کر آواز دی، ـــــــ بولی ختم ہوئی اور آپؐ نے پیالہ اور کمبل خریدار کے حوالے کیا۔ دو درہم صحابیؓ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا "ان میں سے ایک درہم کا غلہ لے کر پہلے گھر پہونچاؤ دوسرے درہم سے ایک "کلہاڑی" خرید کر میرے پاس لاؤ"، جب یہ کلہاڑی خرید کر خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اس میں ایک دستہ لگایا، پھر فرمایا: "جاؤ اس سے جنگل کی لکڑیاں کاٹ کر فروخت کیا کرو اور پندرہ دنوں سے پہلے میرے پاس نہ آؤ"، ـــــــ جب یہ پندرہ روز گزرنے کے بعد "دربارِ نبوی" میں حاضر ہوئے تو چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا، اس وقت ان کے پاس دس درہم تھے جب انہوں نے اس کی اطلاع دی تو آپؐ نے فرمایا: "جاؤ اسی سے کپڑا اور غلہ خرید لو آئندہ کبھی سوال نہ کرنا، اور یونہی محنت و مزدوری کر کے اپنی حاجت و ضرورت پوری کرنا، یہ تمہارے لئے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تم قیامت کے دن خدا کے سامنے اس طرح پیش ہو کہ بھیک مانگنے کا داغ دھبہ تمہارے چہرے پر ظاہر ہو"

کاہلی، بیکاری اور مفت خوری کوئی اچھی چیز نہیں ہے، جو

قوم اس کی خوگر ہو گی، ناممکن ہے کہ اس میں معاشی اور بد اخلاقی جگہ نہ کرے پھر زمانے سے الگ، کارگہہ حیات میں پیچھے رہ جانا پڑے۔ اس حقیقت کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غریب مگر صحت مند صحابی کو نہایت خوش اسلوبی اور دور اندیشی کے ساتھ ایک ذریعہ بتا دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ سے جہاں سماج میں "معاشی رہنمائی" کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اس کے ساتھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جس کی معاشی رہنمائی کی جائے، اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا چاہیئے اور یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیئے کہ فراہم کردہ ذریعہ یا سرمایہ کا استعمال وہ کس طرح کر رہا ہے، اور اس سلسلہ میں ترقی کا کیا حال ہے، وقفہ وقفہ سے رپوٹ بھی لیتے رہنی چاہیئے جیسا کہ آپؐ نے انصاری صحابی سے پندرہ دن بعد آنے اور رپورٹ دینے کے لئے فرمایا ہے، نگرانی کے احساس سے کام میں خوبی اور بہتری پیدا ہوتی ہے، اور جس کی نگرانی کی جارہی ہے، اس کے لئے گویا تدریجی ترقی کے مواقع فراہم کرنا ہے۔

سوال کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صراحتاً ارشاد ہے کہ "جس کے پاس ایک دن کا کھانا ہو، اور جو طاقت ور اور تندرست ہو (خواہ اس کے پاس ایک دن کا کھانا نہ ہو) اس کے لئے "صدقہ" کا سوال کرنا جائز نہیں ہے" مسند احمد میں ہے کہ آپؐ کے پاس صدقہ کا مال آیا تو کچھ لوگ لینے پہونچے، آپ نے فرمایا "لوگو! یہ غنی (جس کے پاس ایک دن کا کھانا ہو) اور بھلے چنگے تندرست کے لئے اور اس شخص کے لئے جو کام کرنے کے لائق اور قوی ہو، جائز نہیں ہے" یہ اور اس قسم کی دوسری حدیثوں کو سامنے رکھتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ بجز

انتہائی مجبوریوں کے دستِ سوال دراز کرنا قطعاً حرام ہے۔ اور اگر اہلِ خیر حضرات صحت مند و طاقتور سائل کو دیتے ہیں تو یہ شریعت کی نگاہ میں قابلِ مؤاخذہ جرم ہے جس سے بچنا چاہئے۔ جہاں تک تعلق آیت "واما السائل فلا تنھر" (اور سائل کو مت جھڑکئے) کا ہے تو اس کے اصل مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مگر آپ کے توسط سے امتِ محمدیہ بھی مخاطب ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی اور صحیح ضرورت مند سائل آجائے تو اس سے تنگ دل نہ ہونا چاہیئے اور نہ سوال سے گھبرا کر جھڑکنے اور ڈانٹنے کا شیوہ اختیار کرنا چاہیئے بلکہ فراخ دلی اور خوش دلی سے پیش آکر اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دے دینا چاہیئے، اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ سائل مستحق ہو یا غیر مستحق۔ اگر اس سے نرم الفاظ میں معذرت کر دی گئی لیکن وہ پیچھا نہ چھوڑے اور اپنی بات پر اڑا رہے جس سے ایک آدمی میں طبعاً انقباض اور تکدّر پیدا ہو سکتا ہے تو ایسے وقت اس سائل کو جھڑک دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ شرعی اعتبار سے جائز ہے جس کا ثبوت البقرہ آیت ۲۷۳ سے ملتا ہے یہ معنیٰ و مفہوم تو اس وقت ہے جب کہ "سائل" کا ترجمہ "مدد مانگنے والا" سے کیا جائے، اگر اس کا ترجمہ "پوچھنے والا" سے کیا جائے (یعنی دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والا) تو اس وقت اس کا مطلب ایک مفسرِ قرآن کے الفاظ میں یہ ہوگا کہ "ایسا شخص خواہ کیسا ہی جاہل اور اجڈ ہو اور بظاہر خواہ کتنے ہی نامعقول طریقے سے سوال کرے، یا اپنے ذہن کی الجھن پیش کرے، بہر حال شفقت کے ساتھ اس کا جواب دو، اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اسے جھڑک کر دور نہ کرو"۔ رہ گئی وہ حدیث جس میں یہ ہے کہ اگر

کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو کر بھی مانگنے آئے تو اسے واپس نہ کرو، تو اولاً یہ کہ محدثین نے اس کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے، چنانچہ امام احمدؒ اس کو بے اصل فرماتے ہیں، امام مالکؒ بھی کوئی وزن نہیں دیتے، دوسرے یہ کہ اس سے مراد بھی حقیقی سائل ہے، اگرچہ ظاہر حال میں وہ وقار اور تمکنت سے آئے اس لئے کہ اگر وہ واقعی ضرورت مند نہ ہوتا تو کیوں مانگنے کی ذلت گوارا کرتا۔

معاشی جدّ و جہد

جو لوگ کمانے پر قادر ہیں انہیں چاہئے کہ خدا کے عطا کردہ دست و بازو کو کام میں لائیں، اور حالات کے تحت معمولی سے معمولی پیشے کو اختیار کرنے میں عار نہ سمجھیں، ایسے لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظر میں کس قدر محبوب ہیں، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ پھاوڑا چلاتے چلاتے ایک صحابیؓ کے ہاتھ سیاہ ہو گئے تھے۔ آپؐ نے دیکھا تو فرمایا "تمہارے ہاتھ پر کچھ لکھا ہے" انہوں نے کہا "میں پتھر پر پھاوڑا چلاتا ہوں اور اس سے اپنے بال بچوں کے لئے روزی پیدا کرتا ہوں" یہ سن کر آپ نے ان صحابیؓ کا ہاتھ چوم لیا، اور پاک کمائی کے حصول میں سخت محنت کی بھی ہمت افزائی فرمائی۔ "کسبِ حلال" کس قدر اہمیت کا حامل ہے اور اس سے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اسے آپ حضرت لقمان حکیم کے اس "حکیمانہ قول" سے معلوم کیجئے! بیٹا! کسبِ حلال کے ذریعہ فقر و فاقہ سے بے نیاز ہو جا، کیونکہ جس کسی کو فقر نے آگھیرا تو اس میں یہ تین خصلتیں گھر کر جاتی ہیں (۱) اس کا دین نرم پڑ جاتا ہے (۲) اس کی عقل میں کمزوری اور فتور آجاتا ہے (۳) اس کی مروتِ انسانی جاتی رہتی ہے، ان

تینوں سے بڑھ کر یہ ہے کہ لوگ اس کو حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

کسبِ معاش میں تعاون

اوپر آپ نے جو کچھ پڑھا، اس کی روشنی میں اہلِ ثروت اور صاحبِ حیثیت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کا کوئی مسلمان بھائی معاشی اعتبار سے پچھڑا ہوا ہو تو دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کے تعاون کے ذریعہ "معاشی استحکام" کی صورت گری میں اپنی سی کوشش سے باز نہ آئیں کہ یہ کوئی دنیا کا کام نہیں بلکہ "دین کا اہم اور ضروری کام" ہے، اور ایک بہت بڑی عبادت ہے، ہم اپنے پڑوس کو دیکھیں اور غور کریں کہ وہ لوگ اپنی قوم کو تعلیمی اور معاشی ہر اعتبار سے اوپر اٹھانے کے لئے کیا کیا اسکیمیں بنا رہے ہیں، ہمارا ایسی کوششوں سے آنکھ بند کر لینا اور اپنی ہی حالت میں مست و مگن رہنا آئندہ خود کو، اور اپنی نسل و قوم کو ہلاکت و بربادی کی نذر کرنے کے برابر ہے۔

بہرحال زیرِ نظر مضمون کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے معاشی مسئلہ میں حوصلہ و ہمت سے کام لیں اور "اپنی دنیا آپ پیدا" کر کے "زندہ" میں ہونے کا ثبوت دیں، اور معاشی اعتبار سے پست مسلمانوں کو صاحبِ حیثیت مسلمان ممکنہ تعاون اور مطلوبہ ذرائع و وسائل فراہم کر کے اونچا اٹھائیں، اربابِ دولت بے محل خیرات و زکوٰۃ سے فقیروں کا روپ دھارنے والوں کی ہمت افزائی نہ کریں، لیکن ساتھ ہی جو واقعی سائل اور حاجتمند ہیں انہیں نظر انداز بھی نہ کریں، بلکہ ان پر فراخدلانہ خرچ کریں، یعنی

اصل، نقل اور صحیح، غلط کی تمیز باقی رہے اور "حق راحق رسید" کے اصول پر عمل ہو۔ یاد رکھیے! آپ کسی مسلمان بھائی بلکہ انسان کی دنیوی مصیبتوں اور پریشانیوں میں کسی مصیبت اور پریشانی کو دور کریں گے تو اللہ رب العزت قیامت کی مصیبتوں اور پریشانیوں میں سے کسی بڑی مصیبت اور پریشانی کو دور فرمائے گا، تو کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کی مصیبت اور پریشانی دور ہو؟۔ اعجاز رحمانی نے یہ پیام بالکل صحیح دیا ہے کہ:

امن و اخوت، عدل و محبت، وحدت کا پرچار کرو
انسانوں کی اس نگری میں انسانوں سے پیار کرو

حضرت صدیق اکبرؓ

گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہانؑ

ہجرت کا موقع ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر حضرت علی کو سُلا کر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے گھر پہونچتے ہیں۔ ان سے ہجرت کی تفصیلات اور اس سے متعلق خدائی ہدایات کا ذکر فرماتے ہیں، اٹھارہ بیس سال کی عمر ہی سے ساتھ رہنے والے ابو بکر بیتابانہ بول پڑتے ہیں: الصحبۃ یارسول اللہ اے اللہ کے رسول! رفیقِ سفر کون رہے گا؟ میں اس کا متمنی اور طلب گار ہوں، آپؐ فرماتے ہیں الصحبۃ ہاں آپ ہی رفیق رہیں گے، اِس جملہ کے سننے کے بعد خوشی سے حضرت ابو بکر کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں جس کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس وقت مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ خوشی سے بھی آنسو نکلتے ہیں۔ اس بات چیت کے بعد شب کی تاریکی ہی میں نبی مکرم اور ان کے رفیقِ محترم مدینہ کی طرف ہجرت کی نیت سے نکل پڑتے ہیں۔ آپ کے یہ رفیقِ محترم حضرت ابو بکرؓ چلنے میں کبھی آپ سے آگے رہتے ہیں کبھی پیچھے چلنے لگتے ہیں، آپؐ اس کو محسوس کر کے وجہ دریافت فرماتے ہیں، جواب ایسا عاشقانہ دیتے ہیں کہ عشق و محبت کی تاریخ نامکمل ہی رہتی اگر حضرت ابو بکر کا یہ جملہ وجود

میں نہیں آتا۔ فرماتے ہیں یا رسول اللہ! جب مجھے پیچھے سے دشمنوں کے تعاقب کا خیال آتا ہے تو پیچھے چلنے لگتا ہوں اور جب ان کے گھات میں بیٹھنے کا خطرہ ہوتا ہے تو آگے آجاتا ہوں۔

گویا آگے یا پیچھے سے دشمن کا اِمکانی حملہ ہو تو اولاً اس کا نشانہ ابوبکر تو بنیں مگر ان کے چہیتے اور محبوب نبی (درود ہو ان پر سلام ہو ان پر) محفوظ رہیں۔

نبیؐ اور صدیق کا سفر جاری ہے، آگے اب کوہِ ثور ہے جس کی چڑھائی سر توڑ ہے، راستہ سنگلاخ ہے، نکیلے پتھر نبی کے پائے مبارک کو زخم کر رہے ہیں، ٹھوکر لگنے سے تکلیف بھی ہو رہی ہے، فیصلہ اسی کے ایک غار میں پناہ لینے کا ہو گیا ہے، ثانی اثنین ابوبکر کو کہاں گوارا کہ ان کے رفیقِ محترم پہاڑی راستے کی ان کلفتوں سے دوچار ہوں، رک کر ۔۔ جاتے ہیں انہیں کندھے پر اٹھاتے ہیں اور غار تک لے آتے ہیں اس ۔ بعد غار کے اندر پہلے جانے کا خطرہ خود مول لیتے ہیں، اسے صا ۔ کرتے ہیں اپنے بدن کے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر اس کے سوراخ کو بند کرتے ہیں، باہر آنے کے بعد خیال آتا ہے کہ ایک سوراخ باقی رہ گیا توقف کی درخواست کرتے ہیں، اندر جانے کے بعد جب اس سوراخ کی طرف سے بھی اطمینان ہو جاتا ہے تو جاں نثار، ادب شناس رفیق نیچی نگاہیں کئے میٹھی زبان سے کہتا ہے "حضور اب آپ اندر تشریف لائیے" اللہ اللہ! کیسا عشق ہے کیسی محبت ہے، حقِ رفاقت کس کس طرح سے ادا کیا جا رہا ہے، نبیؐ کے احترام میں کیسے بچھے چلے جا رہے ہیں، یہ اور اس کے علاوہ سفرِ ہجرت سے متعلق جتنے بھی واقعات حضرت ابوبکرؓ سے منسوب

ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے ذیل میں آتے ہیں ان کی صحیح قدر وہی شخص جان سکتا ہے جس کا دل دردِ محبت سے کچھ آشنا ہو سفرِ ہجرت میں حضرت صدیق کی رفاقت کا تذکرہ قرآن کریم میں بڑی شان کے ساتھ ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بار بار ان کی اِس خدمت کا تذکرہ فرماتے تھے، صحیح بخاری میں ہے کہ حملنی الیٰ دارالھجرۃ، یعنی ابوبکر مجھے دارالہجرۃ (مدینہ) میں سوار کر کے لائے، آپؐ نے اپنی وفات سے پانچ دن پہلے جو خطبہ دیا تھا اس میں فرمایا کہ جس نے کوئی احسان ہمارے ساتھ کیا ہم نے اس کا بدلہ ادا کر دیا سوائے ابوبکر کے کہ ان کی خدمت کا بدلہ قیامت کے دن خدا دے گا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا ابوبکر کے مال نے مجھ کو جو نفع پہونچایا کسی اور کے مال نے اتنا نہیں پہنچایا؛ ایک دوسرے موقعہ پر اس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں فرمایا: بے شبہ جان و مال کے لحاظ سے ابوبکرؓ سے زیادہ مجھ پر کسی اور کا احسان نہیں ہے اس پر حضرت ابوبکر رونے لگے اور عرض کیا! یا رسول اللہ یہ جان اور مال کیا کسی اور کے لئے بھی ہے۔

روایت میں آتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے وقت حضرت ابوبکر کے پاس چالیس ہزار درہم تھے مدینہ پہونچتے پہونچتے کل پانچ ہزار درہم رہ گئے، وہ بھی سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیئے۔

مدینہ میں آمد کے بعد حضرت خارجہ کی شرکت میں تجارت شروع کی اس سے جو بھی آمدنی ہوئی غزوۂ تبوک میں سب حضورؐ کے قدموں پہ لا کر رکھ دیئے اور بال بچوں کے لئے صرف اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ دیا، صحابہ کرام میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بے مثال قربانیوں

اور بے نظیر جاں نثاریوں کا چرچا بہت تھا، یہ حضرات سفرِ ہجرت کے حالات خاص طور پر ان سے پوچھا کرتے تھے اور ان کی زبانِ مبارک سے سننے کے مشتاق رہتے تھے، حضرت عمرؓ اپنے عہدِ خلافت میں فرماتے تھے کہ ابوبکر صدیقؓ صرف شبِ غار کی اپنی خدمت اور قتالِ مرتدین کا کارنامہ مجھے دیدیں اور میری ساری عمر کے تمام اعمال لے لیں تو میں ہی فائدہ میں رہوں گا۔

حضرت ابوبکر کا نام عبداللہ ہے کینت ابوبکر ہے، لقب صدیق اور عتیق ہے، صدیق کے معنی بڑا سچا اور شریعت میں ایک خاص مرتبہ ہے اور عتیق کے معنی آزاد یعنی عذابِ آخرت سے آزاد، یہ دونوں لقب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دو خاص موقعوں پر عطا فرمائے تھے آپ کے والد کا نام عثمان ہے جن کی کینت ابوقحافہ تھی۔ فتحِ مکہ کے بعد حضور کے دستِ مبارک پر مشرف باسلام ہوئے۔ انہوں نے بڑی طویل عمر پائی اور ۱۴ھ میں ۹۰ برس کی عمر میں وفات پائی، آپ کی والدہ ماجدہ کا نام سلمیٰ اور کینت ام الخیر تھی، یہ اپنے شوہر سے پہلے اسلام لائیں انہوں نے بھی طویل عمر پائی۔ حضرت ابوبکر کے بعد لیکن ابوقحافہ سے پہلے وفات ہوئی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نسب آٹھویں پشت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کم و بیش تین برس چھوٹے تھے، مردوں میں پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت ابوبکرؓ ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جس کسی کے سامنے اسلام پیش کیا اس نے تھوڑی بہت جھجھک ضرور محسوس کی لیکن جب ابوبکرؓ کے سامنے اسلام پیش کیا گیا تو انہوں نے

جھجک کے بغیر اس کو قبول کر لیا ۔ اس سلسلہ میں نقل کیا گیا ہے کہ اسلام لانے کے بعد ایک معاصر نے ان سے کہا کہ تم معاملات میں تو بڑے ہوشیار تھے لیکن اس میں دھوکا کھا گئے ۔ اپنے کو فلاں فلاں ٹھاکر دل ور دیوتاؤں کی توجہ اور شفقت وسفارش سے محروم کر دیا اور لائق وفائق اسلاف کے طور طریقوں کو چھوڑ دیا ، اس پر سورۃ العصر نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ محروم رہ جانے والے حقیقتاً کون ہیں ۔ اس ذیل میں یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ میں یہ خصوصیت حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کو عطا فرمائی کہ وہ خود بھی مسلمان ہوئے ، والدین بھی ، اولاد بھی اور سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا ۔

حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے بابرکت کارنامے اسلامی تاریخ کے زرّین باب ہیں خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے جس صبر واستقامت اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیا اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھائی اور بلیغ خطبہ کے ذریعہ انہیں حیات بخش پیغام دیا ، حضور کی تشکیل کردہ فوج کو حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں ملکِ شام کی طرف روانہ کیا ۔ مرتدین کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے اور مدعیانِ نبوت کا خاتمہ فرمایا ، یہ سارے کارنامے ان کی روشن زندگی کو ہمیشہ روشن کرتے رہیں گے ، آپ کا یہ تاریخی جملہ بھی داعیانِ حق کو ہمیشہ مہمیز کرتا رہے گا :

تَمَّ الدِّیْنُ وَانْقَطَعَ الْوَحْیُ أَیَنْقُصُ وَاَنَا حَیٌّ دین کامل ہو چکا ، وحی بند ہو چکی کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میری زندگی میں دین ناقص ہو جائے ۔ آپ کی مدتِ خلافت دو برس تین مہینے اور گیارہ دن ہے ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ دوشنبہ کو مغرب اور عشاء کے درمیان

ہوئی۔ شب میں ہی آپ کو غسل دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور پھر حضرت عمر، عثمان، طلحہ اور عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہم نے قبر میں اتر کر اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور کے پہلو میں لٹا دیا کہ آپ کا سر حضور اقدسؐ کے شانۂ مبارک تک آتا تھا۔

بقول مولانا سعید احمد اکبرآبادی:

"اللہ اکبر! آقا اور سرورِ کونین کے ادب و احترام کا مرنے کے بعد بھی یہ اہتمام ہے کہ برابر نہ ہوں، بجائے ہمدوش ہونے کے زیر سایہ دوش ہی ہو کر رہیں گے گویا حضرت ابوبکرؓ کی زندگی کی رفاقت مرنے کے بعد بھی کام آئی۔ حشر تک رفاقت کا یہ لطف اٹھاتے رہیں گے، حشر کے بعد بھی اس رفاقت کیلئے بہت ساری بشارتیں ہیں، اللہ کی جانب سے عمر بھی پائی تو اپنے یار غار ہی کی عمر ۶۳ سال، سچ ہے: ع

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲

ہجرت اور سنہ ہجری

تاریخی، تذکیری اور فقہی پہلو

لغت میں ہجرت، ہجران اور ہجر کے معنیٰ ہیں کسی چیز سے بیزار ہوکر اس کو چھوڑ دینا اور محاورات عام میں ہجرت کا لفظ ترکِ وطن کے لئے استعمال ہوتا ہے، اصطلاحِ شرع میں دار الحرب کو چھوڑ کر دار الاسلام میں چلے جانے کو ہجرت کہتے ہیں، کسی وطن کو دینی وجوہ کی بنا پر چھوڑ دینا بھی ہجرت میں داخل ہے۔ ہجرت کرنے والے کو مہاجر کہتے ہیں اور مہاجر اصل میں کون ہے؟ اس کی تعریف جو لسانِ نبوی سے ظاہر ہوئی ہے اس سے ہجرت کی صحیح حقیقت سامنے آتی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے "مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے"

ہجرت کی تاریخ بہت پرانی ہے، انبیاء سابقین میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کی ہجرت کے واقعات کافی مشہور ہیں، لیکن جو شہرت اور عظمت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہجرت کو حاصل ہے وہ کسی دوسری ہجرت کو حاصل نہیں ہے۔

مشرکینِ مکہ کی پیہم اذیتوں سے تنگ آکر اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے مدینہ کی سرزمین کو سازگار پاکر حکم خداوندی کے تحت مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا عزم آپ فرما چکے ہیں، نبوت کا تیرھواں سال ہے

صفر کی ۲۷ تاریخ، دن پنجشنبہ کا، جمعہ کی شب، دشمن شہید کرنے کے لئے گھر کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں، آپؐ اٹھتے ہیں، حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیتے ہیں، مکہ والوں کی امانتیں انہیں کے سپرد فرماتے ہیں، آپؐ گھر سے نکل رہے ہیں، ہاتھ میں تھوڑی سی مٹی ہے، قریشی خونخواروں کی آنکھوں کی طرف پھینک رہے ہیں، سورۂ یٰسین کی آیات ابتدا سے فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ تک تلاوت فرمار ہے ہیں، دشمنوں کی بصارت سلب ہوچکی ہے، کسی نے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، صبح کے وقت آپؐ کو بستر پر نہ پاکر اہلِ مکہ کو سخت حیرت بھی ہے اور ندامت بھی، ویسے تو آپؐ رات ہی کے حصہ میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس آکر انہیں اپنی رفاقت میں لئے ہوئے مدینہ کے لئے روانہ ہوگئے ہیں۔

دشمن کے تعاقب کے خیال سے رات کی تاریکی ہی میں غارِ ثور میں چھپ جاتے ہیں، یہاں خفیہ طریقہ پر شام ڈھلے حضرت ابوبکرؓ کی دختر نیک اختر حضرت اسمارؓ کھانا پہنچانے جایا کرتی ہیں، ان کے غلام عامر بن فہیرہ دودھ کے لئے بکریوں کے ریوڑ لے آتے ہیں اور انہیں کے صاحبزادے عبداللہؓ شہری احوال اور چہ میگوئیوں کی خبر دیتے رہتے ہیں، تین دن اور تین راتیں گذر چکیں، آج چوتھی شب ہے، تاریخ یکم ربیع الاوّل روز دوشنبہ (۱۶ ستمبر ۶۲۲ء) غارِ ثور سے نکلتے ہیں۔ سواری کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے دو فربہ اونٹنیاں باہر کھڑی ہیں۔ اب غلام عامر بھی شریکِ سفر ہیں، عبداللہ ابن اُرَیقط کو غیر مسلم ہونے کے باوجود رہبری کے لئے معاوضہ پر طے کرلیا گیا ہے چار کا قافلہ مدینہ کی جانب رواں دواں ہے، قریش کی طرف سے آپؐ

کی گرفتاری پر قیمتی انعام کا اعلان ہو چکا ہے، لوگ آپ کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اس سلسلہ میں سراقہ بن مالک بن جعشم کی ناکامی کا دلچسپ اور عبرت انگیز واقعہ پیش آتا ہے اور آپ ہیں کہ اپنی منزل کی طرف بڑھے جا رہے ہیں۔

راستہ میں ام معبد الخزاعیہ کے پاس سے گذرتے ہیں، آپ کی برکت سے ان کی وہ بکری جس کا دودھ خشک ہو چکا تھا، تیزی سے بھرآتا ہے، سب خوب سیراب ہو کر پیتے ہیں، اثنا ءِ راہ میں بریدہ اسلمی سے ملاقات ہوتی ہے، یہ اپنے قبیلے کے ستّر آدمیوں کے ساتھ مسلمان ہو جاتے ہیں، کچھ آگے چل کر زبیر ابن العوام اور شام سے واپس آتی ہوئی مسلم تاجروں کی جماعت سے ملاقات ہوتی ہے، یہ لوگ آپؐ کو اور حضرت ابوبکرؓ کو سفید پارچہ جات پیش کرتے ہیں۔

۱۲ ربیع الاوّل (بعض نے ۸ اور ۱۸ ربیع الاوّل بھی لکھا ہے) کو مدینہ کی مضافاتی بستی "قبا" میں تشریف لاتے ہیں، چار روز یا چودہ روز قیام فرماتے ہیں، یہاں مسجدِ قبا کی بنیاد ڈالتے ہیں یہیں حضرت علیؓ مکہ سے آکر ملتے ہیں، یہاں سے جمعہ کے دن مدینہ کے اندرونی حصہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں، راستہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرماتے ہیں، نماز سے قبل بلیغ خطبہ ارشاد فرماتے ہیں، یہاں سے آگے بڑھتے ہیں تو تقریباً پانچ سو حضراتِ انصار گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ عشق و محبت اور خوشی کا ایسا دل کش نظارہ ہم نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

انصار میں سے ہر ایک آپؐ کی ضیافت کا شرف حاصل کرنے کی

بیتاب آرزو رکھتا ہے لیکن جاگتی ہے قسمت تو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی
ان کے گھر میں آپؐ نے سات ماہ قیام فرمایا، یہاں آکر سب سے پہلی فکر جو
آپؐ کو دامن گیر ہوئی ہے وہ عبادت گاہ اور دینی درس گاہ کی مسجد نبویؐ
کی تعمیر اور جامعہ صفّہ کے قیام سے یہ خواہش تکمیل پاتی ہے، آپؐ مہاجرین
اور انصار میں بھائی چارگی کی فضا قائم کرتے ہیں، اس موقع پر انصار کے
ایثار اور مہاجرین کے استغناء اور خودداری کے پُرکیف اور سبق آموز
نظارے سامنے آتے ہیں، واقعاتِ ہجرت سے یہ سبق ملتا ہے کہ دعوت
اور عقیدہ کی خاطر ہر عزیز اور محبوب شئی کو بے دریغ قربان کیا جاسکتا ہے
لیکن دعوت وعقیدہ کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں یہ تاریخی حیثیت بھی پیشِ نظر رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے ہجرت کے موقع پر نبوت کے تیرھویں سال ۲۷ر صفر پنجشنبہ کے دن
مکہ مکرمہ کو ترک فرمایا تھا، ۱۲ر ربیع الاول دوشنبہ کو مدینہ منورہ کی مضافاتی
بستی "قبا" میں آپؐ تشریف لائے، اسلامی تقویم اور اسلامی تاریخ کا آغاز
"قبا" میں پہنچنے کے دن ہی سے ہوتا ہے، جس کا پسِ منظر یہ ہے کہ جب
حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور حکومتی کام
بھی بہت زیادہ پھیل گیا، جس میں لامحالہ تاریخ اور ان کے حوالہ کی ضرورت
پیش آئی تو ایک باقاعدہ سنہ تاریخ کا مطالبہ ہر طرف سے شروع ہوا۔
خود حضرت عمرؓ کو بھی اس کا احساس ہوا، چنانچہ انہوں نے اصحابِ رائے
کو جمع کیا، کافی غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد متفقہ طور پر طے پایا کہ
دوسری قوموں کی تاریخ اور سنہ کو ہمیں نہیں لینا ہے بلکہ اسلامی تاریخ کا
سنہ ہجرت کے مہتم بالشان سال کو قرار دینا ہے، جس میں انسانی تاریخ

نے عقیدہ وایمان، صبر و ثبات اور شجاعت و حوصلہ مندی کا وہ قیمتی راز دریافت کیا تھا جو دنیا کے لئے ایک عقدۂ لاینحل بنا ہوا تھا۔ سنہ ہجری بے اسلامی سنہ کے آغاز کا مشورہ ابتداءً اور اصلاً اس مشاورتی اجلاس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے دیا تھا جسے حضرت عمرؓ کے ساتھ دوسرے شرکاء نے اس کی گہری معنویت کے پیش نظر قبول فرمایا تھا۔ اسی مجلسِ مشاورت میں اسلامی تاریخ کے سنہ کا پہلا مہینہ محرم متعین کیا گیا۔ چونکہ عرب حج سے واپسی کے بعد اسی مہینہ سے اپنے کاروبار کی ابتداء کرتے تھے اور یہ مہینہ ہمیشہ سے محترم بھی رہا ہے۔

یہ فیصلہ ۱۷ھ سے ہوا تھا، اس وقت سے اب تک صحابۂ کرام رضؓ، بزرگانِ دین، اور علماءِ عظام قمری مہینوں اور سنہ ھ کا اہتمام کرتے رہے اور مسلمانوں کو بھی اس کے التزام کی تعلیم دیتے رہے ہیں، کیوں کہ یہ منجملہ شعائرِ اسلام سے ہے، قمری مہینوں کے نام زبانِ وحی و نبوت سے ادا ہوئے ہیں اور سنہ ہجری کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک مہتم بالشان واقعہ کی یادگار ہے، مسلمانوں کو چاہیئے کہ سنہ ہجری کی دینی، ملّی اور تاریخی حیثیت کو محسوس کریں اور بلا ضرورتِ شدیدہ (جیسے کہ آج کل کاروبار میں ہے) اس سنہ کو چھوڑکر دوسرے سنہ کو اختیار نہ کریں۔

قمری اور شمسی تاریخوں کے اندراج اور اہتمام کے سلسلہ میں مفتیِ اعظم مولانا محمد شفیع صاحبؒ کی درج ذیل تحریر نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے اور اسلامی شریعت کے مزاج و منشار کی پوری عکاسی اور ترجمانی کرتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ سورۂ یونس آیت (۵) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اور چونکہ احکام اسلامی میں ہر جگہ، ہر موقع پر اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ ان کی ادائیگی ہر شخص کے لئے آسان ہو، خواہ وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہو یا ان پڑھ، شہری ہو یا دیہاتی، اس لئے عموماً احکام اسلامیہ میں قمری سنہ اور مہینے اور تاریخوں کا اعتبار کیا گیا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عدت وغیرہ اسلامی فرائض و احکام میں قمری حساب ہی رکھا گیا ہے
اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ شمسی حساب رکھنا یا استعمال کرنا ناجائز ہے بلکہ اس کا اختیار ہے کہ کوئی شخص نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عدت کے معاملہ میں تو قمری حساب شریعت کے مطابق استعمال کرے مگر اپنے کاروبار، تجارت وغیرہ میں شمسی حساب استعمال کرے شرط یہ ہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں میں قمری حساب جاری رہے تاکہ رمضان اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ اسے جنوری، فروری وغیرہ کے سوا کوئی مہینے ہی نہ معلوم ہوں، فقہاء رحمہم اللہ نے قمری حساب باقی رکھنے کو مسلمان کے ذمہ فرض کفایہ قرار دیا ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ سنتِ انبیاءؑ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین میں قمری ہی حساب استعمال کیا گیا ہے، اس کا اتباع موجبِ برکت و ثواب ہے" (معارف القرآن جلد ۴ صفحہ ۵۰۷ - ۵۰۶، مصطفائیہ، دیوبند)

اسی انداز کی بات مفتی صاحبؒ نے آیت "یسئلونک عن الاھلة" (البقرہ: ۱۸۹) کے ذیل میں قدرے تفصیل سے لکھی ہے، یہ بات بھی اس لائق ہے کہ نظر سے گذر جائے تاکہ اس موضوع پر کوئی تشنگی باقی نہ رہے اور

بات کھل کر سامنے آجاتی ہے، مفتی صاحب اپنی مشہور و معروف تفسیر "معارف القرآن" میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ذیلی عنوان "قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت" کے تحت تحریر فرماتے ہیں :۔

" اس آیت سے اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہو جائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے ——— اسی مضمون کو سورۂ یونس کی آیت میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے : وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب۔ (یونس : ۵) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گذرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو سکے، مگر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے، وہ یہ ہے :

فمحونا اٰیۃ اللیل وجعلنا	پھر مٹایا رات کا نمونہ اور بنا دیا دن
اٰیۃ النھار مبصرۃ لتبتغوا	کا نمونہ دیکھنے کو، تاکہ تلاش کرو
فضلاً من ربکم ولتعلموا	فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم
عدد السنین والحساب۔	کرو گنتی برسوں کی اور حساب۔

(بنی اسرائیل : ۱۲)

اس تیسری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جا سکتا ہے لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآنِ کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعتِ اسلام میں حساب چاند کا متعین ہے، خصوصاً ان عبادات

میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزۂ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شب برات وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویتِ ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں "ھی مواقیت للناس والحج" فرما کر بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے۔ گرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس کو ہر آنکھوں والا افق پر دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے، عالم، جاہل دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلاتِ رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطورِ فرض متعین کر دیا اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا جو عبادتِ اسلامی کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہے، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات، روزہ و حج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا اس زمانہ میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرتِ قومی و ملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری

معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے، ان میں صرف شمسی حساب رکھیں۔ باقی نجی خط و کتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔"

(معارف القرآن جلد ۴ صفحہ ۳۶۸ - ۳۶۷، مفتی محمد شفیع، دیوبند)

قمری مہینوں اور سنہ ہجری کے اہتمام کے سلسلہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے مسلمانوں کی قومی اور ملی غیرت کو جو آواز دی ہے، اس موقع سے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے یہ دو شعر یاد آرہے ہیں، جن پر زیرِ نظر مضمون ختم کیا جارہا ہے، علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

اقدام سے پہلے تحقیق

عہدِ نبویؐ کا ایک سبق آموز واقعہ

"اے اللہ کے رسولؐ! قبیلہ بنی المصطلق کے لوگوں نے تو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور وہ میرے قتل کے بھی درپے تھے۔"

پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کے ایک نمائندہ حضرت ولید بن عقبہؓ نے یہ رپورٹ پیش کی ——— اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات میں سے ایک ام المؤمنین حضرت جویریہؓ بھی ہیں۔ ایک دفعہ ان کے والد حارث بن ضرار (یعنی حضورؐ کے خسر) آپؐ کی خدمت میں ملاقات کیلئے آئے۔ آپؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ حضرت حارث بن ضرار اپنے قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس اور ذی وجاہت لوگوں میں سے تھے۔ آپؐ نے ان کے قبولِ اسلام کے بعد ان کے سامنے اسلام کی بنیادی تعلیمات پیش کیں اور زکوٰۃ کے ادا کرنے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ حضرت حارثؓ نے پوری توجہ کے ساتھ آپؐ کی باتوں کو سنا اور آخر میں کہنے لگے کہ آپ نے جس انداز اور الفاظ میں اسلام کا تعارف کرایا ہے، اس سے اسلام کی حقیقت میرے دل

ییں اتر چکی ہے۔ میں یہاں سے واپس ہوکر اپنے خاندان اور قبیلے کے
دوسرے لوگوں تک آپ کی باتوں کو پہونچاؤں گا اور انہیں زکوٰۃ دینے
پر آمادہ کروں گا۔ آپ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ تک زکوٰۃ کی وصولی
کے لئے اپنا کوئی قاصد روانہ فرما دیجیے۔

غلط فہمی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن ضرار کی گفتگو
اور خواہش کے پیشِ نظر حضرت ولید بن عقبہ کو ان کے قبیلہ اور بستی
کی طرف روانہ فرمایا۔ مقررہ تاریخ کے لحاظ سے بستی والے بستی سے
باہر نکلے تاکہ حضورؐ کے قاصد کا شایانِ شان استقبال کیا جا سکے لیکن
اس موقعہ پر حضرت ولید کو ایک غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ انہوں نے سمجھا کہ
میرے قبیلہ اور اس بستی والے کے درمیان پہلے سے ایک بات پر
رقابت اور عداوت چلی آرہی ہے، اس پسِ منظر میں وہ مجھ سے انتقام
لینا چاہتے ہیں اور بستی میں داخل ہونے سے پہلے قتل کر دینے کا ارادہ
رکھتے ہیں۔ یعنی ان کی "استقبالی پیش قدمی" کو اپنے لئے "انتقامی
کارروائی" تصور کر بیٹھے اور ان سے ملاقات کئے بغیر تیزی کے ساتھ
پلٹ گئے اور مدینہ منورہ آکر حضورؐ کی خدمت میں جو رپورٹ پیش کی اس
کا حاصل ابتدائی ... وں میں موجود ہے۔ یعنی قبیلہ بنی المصطلق نے زکوٰۃ
دینے سے انکار کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ لوگ میرے قتل کے درپے
ہو گئے تھے۔

تحقیقاتی کمیٹی

بستی والے جب اپنی بستی سے اجتماعی طور پر باہر نکلے تو خاص پس منظر کے لحاظ "استقبالی" اور "انتقامی" دونوں پہلو نکل سکتے تھے مگر حضرت ولید کی نظر انتقامی پہلو کی طرف گئی اور اپنے خیال اور بشری تقاضے کے مطابق اسی کو صحیح سمجھا اور رپورٹ پیش کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فطری طور پر اس صورتِ حال سے رنجیدہ اور افسردہ ہوئے مگر فوری طور پر کسی مخالفانہ کارروائی سے احتراز فرمایا اور "وجہ نمائی کی نوٹس" جاری نہیں فرمائی بلکہ ایک باشعور، ہوشمند اور حقیقت پسند انسان کی طرح آپ نے "اقدام" سے پہلے "تحقیق" کو ضروری خیال فرمایا۔ معاملہ چونکہ اہم اور سنگین تھا اس لئے اسی وقت ایک "تحقیقاتی کمیٹی" تشکیل دی جس کے سربراہ حضرت خالد بن ولیدؓ قرار پائے۔ آپؐ نے انہیں بطور خاص ھدایت فرمائی کہ تحقیق سے پہلے ہرگز کوئی اقدام نہیں کرنا، حضرت خالدؓ تحقیقاتی کمیٹی کے اراکین کے ساتھ بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے باہر ہی ایک جگہ رات کو پہنچ کر قیام کیا اور تحقیق حال کیلئے چند آدمی کو بطور جاسوس خفیہ طور پر بستی میں بھیج دیا، ان لوگوں نے آکر خبر دی کہ یہ سب لوگ اسلام و ایمان پر قائم ہیں، نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں، اور کوئی بات وہاں خلافِ اسلام نہیں پائی گئی، حضرت خالد بن ولیدؓ نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ بتلا دیا۔ یعنی مکمل طور پر اپنی "تحقیقاتی رپورٹ" افسر بالا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کر دی۔ قبیلہ بنی المصطلق کے لوگ بھی حضرت حارث کی قیادت میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کی اور یہ کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو پیغامِ حق دے کر بھیجا ہے، نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں نے ان کو دیکھا۔ نہ ہم اسلام سے پھرے نہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ ہم لوگ تو مقررہ وقت پر آپ کے قاصد کے منتظر رہے بلکہ یک گونہ جب تاخیر ہوئی تو ہمیں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ہم لوگوں سے کوئی قصور تو نہیں ہوگیا جس کی وجہ سے حضورؐ کی جانب سے اب تک کوئی قاصد نہیں آیا اور جب ولید ابن عقبہ کی آمد کی اطلاع ملی تو ہم سب مسرت سے لبریز بستی سے باہر نکل کر ان کے استقبال کو گئے مگر وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور ہمارے "استقبال" کو "انتقام" سمجھا اور ملاقات اور بات چیت کئے بغیر واپس ہو گئے

ذرائعِ ابلاغ کا جائزہ

اس تاریخی واقعہ کے پسِ منظر میں قرآنِ حکیم کی ایک آیت نازل ہوئی، جس میں ارشاد ہوا ہے کہ" اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق (اور بعض حالات میں ثقہ اور صالح آدمی بھی) تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو" (الحجرات : ٦)

یہ آیت نہایت اہمیت کے ساتھ بتا رہی ہے کہ اگر کوئی خبر اہم ہو جس پر کوئی "بڑا نتیجہ" مرتب ہو سکتا ہو، یا اس میں کسی کی شکایت ہو اور اس کے لئے کوئی ضرر اور نقصان کا پہلو نکل سکتا ہو تو اس کی خوب چھان بین کر لی جائے۔ اگر خبر دینے والا شخص ایسا ہے جو فاسق ہے اور ظاہر حال بتا رہا ہے کہ اس کی بات اعتماد کے قابل نہیں ہے تو ایسے شخص کی بات تو

لائق تحقیق ہے ہی، لیکن اگر کوئی شخص حضرت ولید بن عقبہ جیسا ثقہ اور صالح ہو مگر بعض قوی قرائن سے کسی "غلطی" یا "غلط فہمی" کا امکان ہو تو اس خبر کو قبول کرنے اور اس پر اپنے کسی "عمل" کو ظاہر کرنے سے پہلے ہر حال میں آخر درجہ کی "تحقیق" ضرور کر لینی چاہیئے۔ تحقیق سے پہلے اقدام کی صورت میں پشیمانی بھی ہو سکتی ہے اور مختلف قسم کی آفتوں، بلاؤں اور مصیبتوں کا زنجیری تسلسل بھی قائم ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے ع "چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی" یعنی کوئی عقلمند ایسا کام ہی کیوں کرے کہ اس کے بعد اسے پشیمانی اور شرمندگی اٹھانی پڑے یہ حکمت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ میں ایک قرأت "فَتَبَيَّنُوْا" (تو تحقیق کر لیا کرو) کی بجائے "فَتَثَبَّتُوْا" کی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اس پر عمل کرنے اور اقدام میں جلدی نہ کرو بلکہ ثابت قدم رہو جب تک کہ دوسرے ذرائع سے اس کا صحیح اور سچا ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ یہ آیتِ کریمہ صحافت اور ذرائع ابلاغ کے سلسلہ میں اسلامی آئین اور آداب کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اس بارے میں دین و شریعت کا کیا مزاج ہے۔

ایک اہم نکتہ

یہاں یہ بات یاد رکھیئے کہ صحابۂ کرام کا شمار "انسانی زمرہ" ہی میں ہے۔ اس انسانی زمرہ کے بارے میں ہمیں بد گمانی نہ ہونی چاہیئے۔ ان کی زندگی میں جو اس طرح کے واقعات ملتے ہیں ان میں دراصل اُس وقت سے لے کر قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے عظیم

درس اور پیغام ہے، وہ یہ کہ ایسے مواقع پر وہ کیا کریں اور ان کے فکر و عمل کا زاویہ اور پیمانہ کیا ہونا چاہیئے۔ ان کی بظاہر "غلطی" میں بھی باطنی طور پر رشد و ہدایت کے صد ہا خزانے چھپے ہوئے ہیں اس لئے اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ نصوصِ قرآن و سنت کی بناء پر یہ ہے کہ "صحابی سے لغزش تو ہو سکتی ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو لغزش سے توبہ کر کے پاک نہ ہو گیا ہو۔ قرآن کریم نے علی الاطلاق ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے " رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ " (اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی) اور رضاءِ الٰہی لغزشوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی جیسا کہ قاضی ابو یعلیٰ نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ قدیمہ ہے، وہ اپنی رضا کا اعلان صرف ان ہی کے لئے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات موجباتِ رضا پر ہو گی۔

(معارف القرآن جلد ہشتم صفحہ ۱۰۶)

ایک معاشرتی بیماری اور اس کا علاج

اس توضیحی نوٹ کے بعد اس طرف توجہ دیجیئے کہ آج مسلم معاشرہ بلکہ مذہب و ملت اور عالم و جاہل کے فرق سے بالاتر ہو کر "انسانی سماج" بے سند اور بے تحقیق باتوں کو بیان کرنے، پھیلانے، ان پر کان دھرنے اور صحیح ماننے کی "بیماری" میں مبتلا ہے۔ یہ بیماری تقریباً "کینسر" کا درجہ حاصل کر چکی ہے جس کی وجہ سے انسان سے "اُنس" رخصت ہوتا جا رہا ہے اور باہمی خلوص و محبت اور احترام و اعتماد کی فضا ختم ہوتی جا رہی ہے۔

ہر شخص ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور اس موقع کا متلاشی اور منتظر رہتا ہے کہ کب کسی کا کمزور اور قابل اعتراض پہلو سامنے آئے کہ اسے ہوا دے کر پوری بستی اور آبادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا دے۔ بہت سے لوگ تو اسے اپنے شیخ اور بڑوں کی قربت کا ذریعہ اور حصولِ محبوبیت کا وسیلہ بھی بناتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری ذرا سی بے احتیاطی سے بے حد سنگین اور خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور قومی، ملی اور اجتماعی اعتبار سے" نقصانِ عظیم" کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کشتی کسی کی پار ہو یا درمیان رہے۔ یہ لوگ حد درجہ خود غرض اور اپنے خول میں بند ہوتے ہیں۔

بے تحقیق باتیں بیان کرنے اور افواہ پھیلانے والوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ان کا آغاز سرگوشیوں اور کانا پھوسیوں سے کیا کرتے ہیں۔ ان کا مجرم ضمیر انہیں ذمہ دارانہ انداز میں پورے اعتماد کے ساتھ برسرِعام بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ رازدانہ لب ولہجہ کے ساتھ دوسرے کے کان میں بات کرتے اور اس طرح دلوں میں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم (المجادلہ آیت ۱۰) نے اس طرزِ کلام کو شیطانی فعل قرار دیتے ہوئے معاشرہ میں سرگوشی اور کانا پھوسی کرنے والوں کی سخت مذمت کی ہے۔ اسی ذیل میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر نہیں ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب بھی کوئی تین آدمی اس طرح کی بات کرتے ہیں تو ان کے ساتھ چوتھا ان کا اللہ ہوتا ہے،

اور پانچ آدمی بات کرتے ہیں تو چھٹا اللہ ہوتا ہے اور ایسے لوگ جب قیامت میں اس کی بارگاہ میں پیش ہوں گے تو وہ خود ہی بتا دے گا کہ دنیا میں ان کے کرتوت کیا تھے۔ (المجادلۃ آیت ۷)

سرگوشی کے علاوہ افواہ، جھوٹ بھی ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان اور سب کچھ ہو سکتا ہے مگر جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں کہ افواہ پھیلانے اور بے سند باتیں بیان کرنیوالا جھوٹا ہوتا ہے بلکہ جو آدمی تصدیق اور تحقیق کے بغیر اسے صحیح مان کر دوسروں کے سامنے نقل کرے، اسلام کے نزدیک وہ بھی جھوٹا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے کہ جو کچھ سُنے اسے (بلا تحقیق) بیان کردے۔" اسی لئے قرآنِ حکیم میں ایک جگہ یہ ھدایت دی گئی ہے کہ "اور اس چیز کے پیچھے مت ہو لیا کر جس کی بابت تجھے علم (صحیح) نہ ہو۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان کی پوچھ ہر شخص سے ہوگی۔" (بنی اسرائیل آیت ۳۶)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قیامت کے دن ہر ہر شخص سے سوال اس کا ہوگا کہ کان سے سننے کا، آنکھ سے دیکھنے کا، دل سے سوچنے، سمجھنے، یقین کرنے کا کام جائز اور صحیح موقعوں پر کتنا لیا اور ناجائز اور غلط موقعوں پر کتنا؟ احساس ذمہ داری کی تعلیم ہر ہر فرد کو اس سے بہتر اور کہاں ملے گی؟ اس پر آج عمل ہونے لگے تو شخصی اور قومی، اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کے کتنے جھگڑے، قصے آج دنیا سے مٹ جائیں"۔ (تفسیر ماجدی) یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ افواہ عموماً سرگوشی اور جھوٹ کے ساتھ ساتھ غیبت یا بہتان

پر بھی مبنی ہوتی ہے اور اسلامی شریعت میں ان دونوں باتوں کو بہت بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے (الحجرات: ۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کے عیوب کی جستجو نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیب کی تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کی تلاش اللہ تعالیٰ کرے اس کو اس کے گھر کے اندر بھی رسوا کر دیتا ہے۔" ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اُسکی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عزوجل اس کی مدد ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے۔

شعور کا امتحان

قرآنِ حکیم اور ارشاداتِ رسولؐ کی ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ اسلام افواہ بازی، افواہ طرازی اور بے سند اور بے تحقیق باتوں کے پھیلانے کا سخت مخالف ہے وہ کسی مسلمان کیلئے کسی حالت میں بھی یہ بات پسند نہیں کرتا کہ وہ اس نجاست سے آلودہ ہو، اس گناہ کی شدت اور اس کا نقصان اس صورت میں تو کئی گنا بڑھ جاتا ہے، جب ملّت ہنگامی دور سے گذر رہی ہو اور اس کا دشمن اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہو، ایسے حالات میں افواہیں پھیلانا اور غیر صحیح باتوں کو رواج دینا

یقیناً دشمن کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسے لوگوں سے خبردار رہیں اور معاشرے میں ایسا شعور اور احساس بیدار کر دیں کہ وہ ایسے عناصر کا وجود ہی برداشت کرنے سے انکار کر دے۔ کسی مسئلہ میں کسی مرحلہ اور موقع پر کسی طرح کے "اقدام" کی ناگزیر ضرورت ہو تو پہلے اچھی طرح تحقیق کر لیا کریں۔ تحقیق سے پہلے اقدام اور افواہ طرازی کا سلسلہ معاشرے کی "بیمار ذہنیت" کی علامت ہے اور عقل و خرد اور دین و شریعت دونوں کی نگاہ میں "جرمِ عظیم" ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ نے یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو جہاں میں کوئی برا نہ رہا،

****

اسلامی شریعت ـــــ تعارف اور تقاضے

حضرت مسکین شاہ صاحب کا ایک سبق آموز واقعہ

اہلِ فکر و نظر حیدرآباد کے ممتاز اور اکابر اولیاء و مشائخ میں حضرت مسکین شاہ صاحب نقشبندی مجددیؒ کو بھی شامل کرتے ہیں، ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے اور وفات کا سال ۱۳۱۴ھ ہے۔ اس طرح کم و بیش (۱۱۴) برس کی طویل عمر پائی۔ حیدرآباد کے محلہ علی آباد (احاطہ مسجد الماس) میں ان کا مقبرہ ہے۔ اپنی زندگی میں شریعت و سنت کا بڑا ہی پاس و لحاظ رکھتے تھے، آخر عمر تک ہوش و حواس باقی رہے اور ذوقِ ذکر و فکر جوان رہا، عبادت کے اہتمام اور مریدوں کی تلقین میں بھی کوئی فرق نہیں آیا، وفات سے ایک سال پہلے نقاہت زیادہ آگئی تھی، مگر اس کے باوجود فرائض و سنن اور نوافل و تہجد بحالتِ قیام وقعود ادا کرتے رہے۔ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوکر بہت سے لوگوں نے سلوک کی منزلیں طے کی ہیں، ان کے ہاتھ پر بیعت کرکے توبہ اور اصلاحِ حال کی توفیق جن لوگوں کو ملی ہے، ان کی بہت بڑی تعداد ہے، اس کے باوجود ہمیشہ خوف کھاتے رہے اور حسنِ خاتمہ کی دعا کرتے رہے۔ حضرت محمود شاہ صاحب نانديڑی نے اپنے

تحریر کردہ روزنامچہ میں آپ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "میرے مرید سوا لاکھ ہیں مگر میں محتاج حسنِ خاتمہ ہوں۔ اگر تمام دنیا مرید ہو جائے اور آپ بے ایمان مرے تو وہ مریدی کس کام کی"؟ یہ بھی فرماتے تھے کہ "دنیا ایسی ہو جس میں آخرت خراب نہ ہو"۔

لاکھوں میں انتخاب ہیں مسکین شاہ ولی

حضرت مسکین شاہ صاحبؒ کی زندگی میں جو تقویٰ و پرہیزگاری اور استغنا و بے نیازی تھی۔ اس کے سبب آپ کے دور کے رؤسا اور امرا بھی آپ کی خدمت میں حد درجہ ادب و احترام کے ساتھ آکر اکتسابِ فیض کرتے رہے، دکن کے نظامِ پنجم افضل الدولہ بہادرؒ اور نظامِ ششم میر محبوب علی خاں بہادر کو بھی آپ سے شرفِ بیعت حاصل رہا ہے۔ آخر الذکر جب آپ کے پاس آئے تھے تو بیعت کے بعد سوا سو اشرفی کا نذرانہ دیتے ہوئے اپنے ان شعری جذبات کا بھی نذرانہ پیش کیا تھا:

مرشد میرے جناب ہیں مسکین شاہ ولی
لاکھوں میں انتخاب ہیں مسکین شاہ ولی

دینِ مبین کو رونق و تعظیم جو دیے
واللہ وہ جناب ہیں مسکین شاہ ولی

نورِ محمدی میں فنا خود کو کر دیے
کیا فرد لاجواب ہیں مسکین شاہ ولی

میں قطرہ ہوں سحاب ہیں وہ ذاتِ مستطاب
میں ذرہ، آفتاب ہیں مسکین شاہ ولی

آصفؔ کو راستہ یہی بخشش کا مل گیا
خضرِ رہِ صواب ہیں مسکین شاہ ولی

حضرت مسکین شاہ صاحبؒ کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خدمت میں بیعت کیلئے مردوں کے ساتھ عورتیں بھی آتی تھیں، جہاں تک تعلق "بیعت" کا ہے تو یہ اصطلاح دراصل "بیع" سے نکلی ہے، جس کے لغوی معنی بیچ دینے کے ہیں۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد کسی پیغمبر یا صاحبِ نسبت بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے گناہوں سے تائب ہونا اور اس بزرگ کی اطاعت کرنا ہے۔ اسی جذبہ کے ساتھ ایک خاتون حضرت کی خدمت میں آئیں اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے عرض کیا کہ مجھے بیعت کر لیجئے، حضرت نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور فرمایا کہ مردوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ عورتوں کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے، خواہ اس کا تعلق بیعت کے مقدس عمل ہی سے کیوں نہ ہو؟

بیعت کی حیثیت

ذرا یہاں ٹھہریئے اور حضرت مسکین شاہ صاحبؒ کے ہاتھ کھینچ لینے والے عمل کی معنویت کو خدا کی شریعت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے آئینہ میں دیکھئے، اس کے لئے سب سے پہلے سورہ ممتحنہ (نمبر ۶۰ پارہ ۲۸) کی آیت (۱۲) کا ترجمہ مطالعہ میں لائیے:-

"اے نبی (مکرم) جب حاضر ہوں آپ کی خدمت میں
مؤمن عورتیں تاکہ آپ سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ

اللہ کے ساتھ نہ کسی کو شریک کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ لگائیں گی جھوٹا الزام جو انہوں نے گھڑ لیا اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان اور نہ آپ کی نافرمانی کریں گی کسی نیک کام میں تو آپ ان کو بیعت کر لیا کیجئے اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کر لیا کیجئے، بیشک اللہ بڑا مغفرت والا ہے:

قرآنِ حکیم کی آیت کے اس ترجمہ کے ساتھ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی مختصر تشریح بھی اپنی نگاہ میں لے آیئے، محترم پیر محمد کرم شاہ الازہری سجادہ نشین بھیرہ لکھتے ہیں:۔

"جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور دھڑا دھڑ لوگ حضورؐ کی بیعت کر کے مشرف باسلام ہونے لگے تو مکہ کی عورتیں بھی بیعت کیلئے حاضر ہوئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروقِ اعظمؓ کو عورتوں کی بیعت لینے پر مقرر فرمایا اور جن باتوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان پر عمل کرنے کا ان سے پختہ وعدہ لیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عورتوں سے کئی بار بیعت لی، لیکن کسی عورت کے ساتھ بیعت لیتے وقت مصافحہ نہ کیا، کبھی تو زبانی ان امور کی پابندی کا وعدہ لیا، کبھی پانی سے بھرے ہوئے پیالہ میں اپنا دستِ مبارک ڈالا اور اس کے بعد بیعت کرنے والی عورتوں کو اپنا ہاتھ رکھنے کا حکم دیا، کبھی کپڑا دستِ مبارک میں لے کر عورتوں سے بیعت لی۔

جن امور پر بیعت لی گئی ان میں سرفہرست یہ ہے کہ وہ

کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ چوری نہ کریں گی۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ بدکاری نہیں کریں گی، چوتھی بات یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، کیوں کہ عرب معاشرہ میں اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دینا وجہ عزت و فخر تھا، نیز کئی لوگ بھوک سے تنگ آ کر بھی اپنی اولاد کو مار ڈالا کرتے تھے۔ اسی میں اسقاطِ حمل بھی داخل ہے، جب اس میں جان پڑ چکی ہو۔ جائز اور ناجائز حملوں کے اسقاط کا ایک ہی حکم ہے، شریعتِ اسلامیہ میں اس کو قتل شمار کیا جاتا ہے۔ پانچویں چیز جس سے منع کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ عورتیں اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی الزام اور بہتان تراشی نہ کریں۔ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

کسی کے نوزائیدہ بچے کو اچک کر اپنی گود میں ڈال لینا اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ یہ میرا بچہ ہے، اسی طرح بدکاری سے جو حمل قرار پائے اسے اپنے خاوند کی طرف منسوب کر دینا نیز کسی دوسری عورت پر بدفعلی کا الزام لگانا، یہ تمام صورتیں اس آیت میں داخل ہیں اور اسلام نے ان تمام مذموم حرکتوں سے باز رہنے کا تاکیدی حکم فرمایا ہے، چھٹی بات یہ ہے کہ جس کی پابندی کا ان سے وعدہ لیا جا رہا ہے کہ ہر نیک کام جس کا حضور حکم دیں گے وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گی۔"

(تفسیر ضیاء القرآن جلد ۵ صفحہ ۲۰۴)

عورتوں سے بیعت کی نبوی صورت کیا نوعیت کیا ہوتی تھی ؟
اس کا اجمالی حال اوپر آچکا ہے، تاہم یہ موقع ہے کہ اس کا قدرے تفصیلی تذکرہ بھی سامنے آجائے، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تفسیر مظہری کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "عورتوں کی یہ بیعت صرف گفتگو اور کلام کے ذریعہ ہوئی۔ مردوں کی بیعت میں جو ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا دستور ہے، عورتوں کی بیعت میں ایسا نہیں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے کبھی کسی غیر محرم کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔"

(معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۴۱۰)

امام بخاریؒ نے یہ روایت اپنی صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے۔

" امیمہ بنت رُقیقہ کا بیان ہے کہ میں اور چند عورتیں حضورؐ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوئیں اور آپؐ نے قرآن کی اس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا۔ جب ہم نے کہا "ہم معروف میں آپؐ کی نافرمانی نہ کریں گی،" تو آپؐ نے فرمایا فیما استطعتن واطقتن جہاں تک تمہارے بس میں ہو اور تمہارے لئے ممکن ہو، ہم نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسول ہمارے لئے خود ہم سے بڑھ کر رحیم ہیں،" پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہاتھ بڑھائیے تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں، آپؐ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا بس میں تم سے عہد لوں گا۔ چنانچہ آپؐ نے عہد لے لیا۔ ایک اور روایت میں ان کا بیان ہے کہ آپؐ نے ہم میں سے کسی عورت سے بھی مصافحہ نہیں کیا۔" (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن ابی حاتم)

ابو داؤد نے مراسیل میں شعبی کی روایت نقل کی ہے کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت ایک چادر حضورؐ کی طرف بڑھائی گئی، آپؐ نے بس اسے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا یہی مضمون ابن ابی حاتم نے شعبی سے۔ عبدالرزاق نے ابراہیم نخعی سے اور سعید بن منصور نے قیس بن ابی حازم سے نقل کیا ہے۔

ابن اسحاق نے مغازی میں ابان بن صالح سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ پانی کے ایک برتن میں ہاتھ ڈال دیتے تھے اور پھر اسی برتن میں عورت بھی اپنا ہاتھ ڈال دیتی تھی۔ (تفہیم القرآن جلد ۵ صفحہ ۴۴۹)

خدا کی شریعت اور رسول کی سنت سدا بہار ہے

آپ نے ٹھہر کر معلوم کر لیا کہ حضرت مسکین شاہ صاحبؒ کے ہاتھ کھینچنے میں کیا مصلحت اور حکمت تھی اور ان کا عمل شریعتِ الٰہی اور سنتِ نبویؐ کے سانچے میں کس قدر ڈھلا ہوا تھا لیکن وہ خاتون جو بیعت کے لئے حاضر خدمت ہوئی تھیں وہ خاموش نہیں ہوئیں، انہوں نے برجستہ کہا "حضرت! میری خواہش تو یہ ہے کہ میں اپنے ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دوں۔ اس میں میرے لئے روحانی تسلی اور تسکین کا سامان زیادہ فراہم ہوگا اور حرج کی بھی کیا بات ہے۔ میں بھی بوڑھی ہوں اور آپ بھی بوڑھے ہیں۔ ماضی کے لئے توبہ اور مستقبل کے لئے اطاعتِ الٰہی کی نیت سے آئی ہوئی ایک بوڑھی عورت ایک صالح، متقی اور بوڑھے بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرے تو اس میں کسی نفسانی شر کا کیا اندیشہ ہے؟"

خاتون کی اس بات کو سننے کے بعد حضرت مسکین شاہ صاحبؒ نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا جسے آنکھ کے راستہ سے دل میں اتارنے اور دماغ میں بسانے کی ضرورت ہے۔ فرمایا "یہ صحیح ہے کہ میں بوڑھا ہوں اور تم بھی بوڑھی ہو مگر خدا کی شریعت اور اس کے رسولؐ کی سنت تو جوان اور سدا بہار ہے۔"

شاہ صاحبؒ کے اس جملہ کا صاف مطلب ہے کہ عورتوں سے بیعت کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جوان اور بوڑھی عورت کا کوئی فرق نہیں فرمایا ہے۔ اس طرح کہ جوان ہو تو آپؐ نے ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنے سے احتراز کیا ہو اور بوڑھی ہو تو ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کی ہے، عمر کی قید سے بالاتر ہو کر ہر سن و سال کی عورت سے بیعت لیتے وقت آپؐ نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے بلکہ بغیر چھوئے ہوئے وہی شکلیں اختیار فرمائی ہیں جو اوپر گذر چکی ہیں، اس لئے میں (شاہ صاحبؒ) تمہارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت نہیں کروں گا۔ تمہارے اور میرے بوڑھے ہونے سے خدا کی شریعت اور رسول کی سنت بوڑھی نہیں ہو جائے گی اور کسی "حکم" کے معاملہ میں اس پر ضعف و ناتوانی کچھ اس طرح طاری نہیں ہو جائے گی کہ اسے دبا یا دبوچ کر میری یا تمہاری خواہش تکمیل پا جائے یا امتدادِ زمانہ نے شریعت اور سنت پر کہنگی اور بوسیدگی کی چادر ڈال دی ہو اور اس کا رخِ زیبا ماند پڑ گیا ہو۔ حضورؐ اور صحابہؓ کے دور میں تو اس کے چہرے پر نکھار اور تازگی تھی، آج وہ چہرہ کمھلا اور مرجھا گیا ہے اور آنے والا کل اسکی

پژمردگی اور بے رونقی میں اضافہ ہی کرتا چلا جائے گا۔ ایسی کوئی بات خدا کی شریعت اور رسولؐ کی سنت کے ساتھ منسوب نہیں کی جاسکتی، وہ ہر دور، ہر زمانہ، ہر ملک، ہر علاقہ اور ہر عمر کے لوگوں کے لئے "جوان" ہے۔ اس کے اصول و کلیات ایسے ہیں کہ تغیر پذیر دنیا کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑتا اور احکام شرعیہ میں بدلتے ہوئے حالات اور ادوار کی پوری رعایت موجود ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی شریعت کے احکام کبھی از کار رفتہ یا آوٹ آف ڈیٹ نہیں ہو سکتے۔ وہ حد درجہ عصری اور اپ ٹو ڈیٹ ہیں۔ اگرچہ علامہ اقبالؒ نے انسان کو مخاطب کرتے ہوئے درج ذیل شعر کہا ہے مگر انسان کی "اسلامی شریعت" کے بارے میں بھی یہ شعر نہایت موزوں ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اسلامی شریعت کا امتیاز

اردو دائرہ معارف اسلامیہ (شائع کردہ دانش گاہ پنجاب، لاہور) میں "شریعت" کے موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے صحیح لکھا گیا ہے کہ:

شریعت اسلامی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے کئی لحاظ سے مختلف و ممتاز ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے اصول و مبادی شروع میں قلیل و متفرق شکل میں ہوتے ہیں، بعد میں جمع و تنقیح کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس شریعت اسلامی کے

اصول شارع علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ایک کامل و شامل، جامع و مانع اور مہذب و منقح شکل میں انسانیت کے لئے پیش کر دیئے گئے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں نقص ہوتا ہے جو مرورِ زمانہ کے ساتھ تغیر و تبدل کے مراحل سے گذرتے رہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل شریعت مکمل و اکمل صورت میں ہے، جسے وقت کی رفتار بوسیدہ یا نا قابلِ عمل نہیں بنا سکتی۔ اسی طرح انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کسی خاص قوم، وقت اور ملک کے لئے ہوتے ہیں جو دوسری قوم، وقت اور ملک کے لئے موزون نہیں ہو سکتے۔ جب کہ شریعتِ اسلامی تمام انسانیت اور تمام زمانوں کیلئے ہے اور کسی قوم، زمانے یا ملک سے مقید نہیں۔ عام قوانین اور شریعتِ اسلامی میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر مخلوق کے وضع کردہ ہیں جب کہ شریعت کا وضع کرنے والا خالقِ کائنات ہے۔"
(اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۱۱ صفحہ ۵۰۷)

عائلی قوانین کی اہمیت

جہاں تک تعلق عائلی قوانین کا ہے تو اس کا تعلق بھی دین و شریعت سے گہرا ہے۔ علماء محققین اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاقیات کے احکام کے مجموعے کو "شریعت" قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عائلی یا معاشرتی امور (پرسنل لاز) کا تعلق "معاملات" سے ہے اور معاملات کا تعلق پوری نوعِ انسانی کے باہمی روابط سے ہے۔ اس لئے عائلی اور شخصی قوانین کو اسلامی

نقطۂ نظر سے" دائرۂ شریعت" سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ان کی اہمیت اور حقیقت کو سمجھے اور ان پر عمل کئے بغیر کوئی شخص مسلمان بھی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان ان قوانین اور احکام کو سمجھتے ہوئے ان پر سختی سے عمل کریں اور زندگی کے ہر مرحلہ پر حضرت مسکین شاہ صاحبؒ کے اس حکیمانہ بلکہ عاشقانہ جملہ کو یاد رکھیں کہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو کر" خدا کی شریعت اور اس کے رسول کی سنت جوان ہے"۔ بقول علامہ اقبالؒ:

ے یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

جب عمل کا رُخ اللہ کی طرف ہوتا ہے

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ (ولادت ۱۲۸۰ھ، وفات ۱۳۶۲ھ) اونچے درجے کے عالم، عارف، محقق، مصنف اور مصلح تھے، خانقاہ اور کتابوں کے ذریعہ ان کا علمی اور احسانی فیضان خوب جاری ہوا، آج بھی ان کے مواعظ دلوں کو گرماتے، ذہن ودماغ کو آسودگی بخشتے اور قوتِ عمل میں تحریک پیدا کرتے ہیں، اس لحاظ سے یقیناً وہ "غزالیٔ وقت" تھے اس غزالیِ وقت کا ایک واقعہ سنئے، بڑا دلچسپ، نظر افروز اور دلِ زندہ کے لئے انقلاب آفریں ——— واقعہ ایک عارف باللہ کا ہے، اسے ایک عارف باللہ ہی کی زبانی سنئے، مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ فرماتے ہیں:

"حضرت تھانویؒ کے یہاں پہلے ضابطہ تھا کہ جب کوئی وارد (نیا آنے والا) آئے تو بغیر سوال کئے خود بتائے کہ میں فلاں ہوں، فلاں جگہ سے آیا ہوں اور فلاں مقصد کے لئے حاضر ہوا ہوں، لیکن جب حضرت والا کی نظرِ مبارک سے یہ حدیث گزری:

"بالداخل وحشة تلقونه بمرحبا" (الدیلمی) یعنی نئے آنے

والے کو اجنبیت کے سبب ایک قسم کی حیرت زدگی اور بدحواسی ہوتی ہے، اس لئے اس سے آؤ بھگت کے ساتھ ملا کرو، تاکہ اس کی طبیعت کھل کر مانوس ہو جائے اور حواس بجا ہو جائیں اور ہر قول و فعل کا موقع سمجھ کر نہ خود پریشان ہو نہ دوسرے کو پریشان کرے۔

حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ حدیث میری نظر سے اس وقت گزری جب کہ میری عمر اکیس سال کی ہو چکی تھی، اللہ تعالیٰ نے حدیث کی برکت سے مجھے توفیق عطا فرمائی کہ اب آنیوالے سے میں خود اس کا مقام، اس کے آنے کی غرض اور اس کا مشغلہ پوچھ لیا کرتا ہوں، اس سے ضروری حالات معلوم ہوتے ہیں، اور وہ مانوس ہو جاتا ہے۔" (معرفتِ الٰہیہ ص: ۲۱۷)

موعظت و نصیحت کے مختلف پہلو

اس واقعہ سے یہ تو سبق ملتا ہی ہے کہ مہمان اور نئے آنے والے کے ساتھ محبت اور اپنائیت کا کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے، اور مرحبا اور خوش آمدید کہہ کر کس طرح لطف و مہربانی اور خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرنا چاہیئے کہ آنے والا اپنے سفر کی صعوبت کو بھول جائے، اس کے دل سے اجنبیت کا احساس جاتا رہے اور وہ یہ سمجھے کہ میں اپنے کسی عزیز کے پاس آیا ہوں جہاں ہر طرح کے سکون کا سامان میسر ہے، اسی لئے ایک حدیث میں صراحتاً اس کا ذکر ہے کہ جب کسی اجنبی آدمی سے تمہاری ملاقات ہو تو اس کا اور اس کے والد کا نام پوچھ لو، اس کی مصروفیت اور پیشہ کے بارے میں بھی دریافت کرلو، اس سے اجنبیت دور ہوگی، اور باہمی تعارف سے آپسی محبت

پیدا ہوگی۔

تاہم مذکورہ واقعہ کی تہ میں اصل پیغام جو چھپا ہوا ہے' وہ یہ ہے کہ کسی حق کا اعتراف اور اظہار انسان کی سب سے بڑی خوبی اور کمال ہے' یہی علمی دیانت' انسانی شرافت اور حق نگری اور حق پرستی کا تقاضا ہے' اس سے انسان کی شان گھٹتی نہیں بڑھتی ہے' عزت کم نہیں ہوتی زیادہ ہوتی ہے۔ اعتماد مجروح نہیں ہوتا بحال ہوتا ہے۔

باخبر لوگ اس سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ مضبوط دلیل سامنے آجانے کے بعد اپنے کسی قول اور مانوس عمل پر جمے رہنا اور مختلف توجیہات اور دور دراز تاویلات کے ذریعہ اس کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرنا اہلِ حق کا شیوہ نہیں' اہلِ باطل کا وطیرہ ہے' حق پرست تو حق کے سامنے جھک جاتے ہیں، غزالِ وقت اور بوحنیفۂ عصر ہونے کے باوجود بشر ہونے کے ناطے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتے نہیں ہیں اور نہ ہی غلطی پر پردہ ڈالنے کی مذموم سعی کرتے ہیں، ایسی کسی بھی غلطی یا چوک کے بعد اعتراف "جہل" کی علامت نہیں' عین "علم" کی دلیل ہے، عمر کا کوئی بھی حصہ ہو اور نسبی' جاہی' مالی اور علمی شہرت کی کوئی بھی منزل ہو، قبولِ حق اور اظہارِ حق کی راہ میں کسی بھی چیز کو آڑ نہیں بنانا چاہیے ہر حالت میں ہر صورت میں حق' حق ہے اور باطل' باطل ہے' جس کا برملا اعتراف اور اظہار انسان کو حق پرستوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان کے عمل کا رخ اپنے جیسے انسان کی طرف نہیں بلکہ خدا کی طرف ہو، اسی کی خوشی اور ناخوشی کو اپنے لئے معیار اور پیمانہ بنایا گیا ہو، خلق سے نظر ہٹ کر خالق پر جم گئی ہو

حضرت امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں بے شمار انسان ہیں، میں کس کی خوشی اور ناخوشی کا خیال کروں، ایک کو خوش کیا تو دوسرا ناخوش دوسرے کو خوش کیا تو تیسرا ناخوش۔ اس لئے میں نے ٹھان لیا ہے کہ اپنی زندگی میں بس ایک ہی کی خوشی اور ناخوشی کو پیشِ نظر رکھوں گا، وہ ہے اللہ واحد کی ذاتِ گرامی"۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر جوہر شناس نگاہ میں بہت پہلے قدر حاصل کرچکا ہے۔ ؎

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے   کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف

لرزا دینے والی حدیث

یہ تو ہوئی اخلاص وللّٰہیت کی بات، اس کے مقابلہ میں ریا اور نام ونمود ہے جس میں دنیا کے لوگوں کی خوشنودی اور یہاں کی واہ اور دادِ تحسین پیشِ نظر رہتی ہے، یہ جذبہ کس قدر خطرناک ہے اس کا اندازہ درج ذیل حدیث نبویؐ سے ہوسکے گا، جسے سنتے اور پڑھتے ہوئے دلِ حساس رکھنے والے کا پورا جسم لرز اٹھتا ہے، اسی لئے اس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ اس روایت کو بیان فرماتے ہوئے گر پڑتے تھے، روایت یہ ہے:

" قیامت کے دن سب سے پہلے تین شخصوں کے متعلق عدالتِ الٰہیہ سے جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا، ان میں بھی اول نمبر پر ایسے شخص کی پیشی ہوگی جو جہاد میں شہید ہوا ہوگا، وہ جب حاضرِ عدالت ہوگا تو اللہ تعالیٰ پہلے اس کو نعمتیں جتائے گا اور یاد دلائے گا، وہ اس کو یاد آجائیں گی، پھر اس سے فرمایا جائے گا بتلا تو نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا، اور کیا عمل کئے؟ وہ عرض کرے گا، خداوندا، میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور تیری رضا

طلبی میں جان عــزیز تک قربان کردی . حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے، تونے تو صرف اس لئے جہاد کیا تھا کہ تو بہادر مشہور ہو' دنیا میں تیری بہادری کا چرچا ہو چکا . پھر اللہ کے حکم سے اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا . اسی طرح ایک "عالم دین" اور عالم قرآن (جس میں قرآن کے حافظ و قاری بھی داخل ہیں) حاضر عدالت کیا جائے گا اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تونے کیا اعمال کئے ؟ وہ کہے گا میں نے تیرے دین اور تیری کتاب کے علم کو پڑھا اور پڑھایا' اور یہ سب تیری رضا کے لئے کیا ، حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تونے تو عالم' مولانا . حافظ اور قاری کہلانے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا ، پھر بحکم خداوندی اسکو بھی دوزخ میں ڈالدیا جائے گا ، پھر اس کے بعد ایک شخص کو پیش کیا جائے گا ، جس کو اللہ نے بہت کچھ مال و دولت دیا ہوگا ، اس سے بھی سوال کیا جائے گا کہ تونے کیا کیا ؟ وہ عرض کرے گا کہ خداوندا ! میں نے خیر کا کوئی ایسا شعبہ نہیں چھوڑا جس میں تیری رضا جوئی کے لئے اپنا مال خرچ نہ کیا ہو حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے' تونے تو صرف اس لئے مال خرچ کیا تھا کہ دنیا تجھ کو سخی کہے' تو دنیا میں تیری سخاوت کا خوب چرچا ہو گیا ، پھر اس کو بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا "۔ (صحیح مسلم)

اخلاص کا اثر

معلوم ہوا کہ اللہ کے یہاں وہی عمل کام آئے گا جو نیتوں کے فساد بالخصوص ریا و نفاق سے پاک ہو' اور صالح نیت سے محض رضاءِ الٰہی کے لئے کیا گیا ہو' اسی کو دین کی اصطلاح میں "اخلاص" کہتے ہیں ، جس کا ذکر

اوپر کیا گیا ہے، اس کی ایک مثال تاریخ طبری کے حوالہ سے پڑھئے کہ :

"جب مسلمان مدائن پہونچے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے تو ایک شخص اپنے حصہ کا مال غنیمت لایا اور خازن کے سپرد کر دیا، لوگوں نے کہا ایسا قیمتی سامان تو دیکھنے میں نہیں آیا، ہمارے پاس جو مال ہے اس کو اس سے کچھ نسبت نہیں، ان لوگوں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے اس سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا معاملہ نہ ہوتا تو تم کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ ان لوگوں نے اندازہ کرلیا کہ یہ معمولی شخص نہیں، انہوں نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں یہ نہیں بتا سکتا اس لئے کہ تم تعریف کردگے۔ سب تعریف اللہ کی ہے۔ اسی کے ثواب پر میں راضی ہوں، جب وہ واپس ہوا تو لوگوں نے ایک آدمی پیچھے کردیا کہ معلوم کرد کون ہے؟ معلوم ہوا کہ عامران کا نام ہے' اور عبد قیس قبیلہ سے انکا تعلق ہے"۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۱۰۷)

محدّثِ دکن کی نصیحت

یہ ایک حقیقت ہے کہ نام ونمود اور سستی شہرت کے لئے جو کام کیا جاتا ہے، وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے، اکثر حالات میں ایسا کام استحکام حاصل نہیں کرپاتا، کام کے شجر کو اگر اخلاص وللہیت کے پانی سے سیراب کیا جائے تو اس کی ٹہنیاں اور شاخیں سرسبز وشاداب رہتی ہیں، بڑھتی پھیلتی، پھولتی ہیں، اور یہاں (دنیا) اور وہاں (آخرت) دونوں جگہ اپنی بہارِ جانفزا دکھلاتی ہیں، اللہ کا مخلص بندہ دنیا والوں کی پسند و ناپسند اور ان کے نیک و بدخیالات و تأثرات سے بے نیاز ہوتا ہے، وہ اپنے مالکِ

حقیقی اور حاکم اصلی کی خوشی اور ناخوشی کو ہمہ دم ملحوظ رکھتا ہے۔ محدث دکن حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحبؒ کے درج ذیل، گرانقدر ملفوظات کو نگاہ کی راہ سے دل میں اتار لیجئے، اور اسی کے سہارے اس کی خوشبو کو ذہن و دماغ میں بسا لیجئے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر ساری دنیا بھی ہم سے روٹھ جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ فکر اس کی رہے کہ ہمارا محبوب حقیقی جس کو ہم نے اپنا دل دے رکھا ہے کہیں روٹھ نہ جائے اور ہر وقت اس کے منانے اور راضی کرنے کی سعی کرتے رہیں، کیونکہ اسی سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ کسی کے بگڑنے سے رنج و صدمہ نہ ہو، بلکہ فکر یہ رہے کہ ہمارا مالک حقیقی خدائے تعالیٰ ہم سے خفا نہ ہو جائے جس کے ناخوش ہونے سے دنیا بھی خراب ہو جاتی ہے اور آخرت بھی برباد، ساری مصیبتیں اسی کے لئے جھیلی جاتی ہیں، اگر وہ راضی نہ ہو، اور خفا ہو جائے تو ہماری زندگی ہی بے کار ہے، اس لئے ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرو، ہم دنیا کو دکھانے کے واسطے کرتے ہیں: دنیا کے دکھانے کے لئے جو کام کیا جاتا ہے وہ سب یہیں رہ جائے گا اور خدائے تعالیٰ کے سامنے خالی ہاتھ جانا پڑے گا۔

ہمارا ہر کام خدائے تعالیٰ کے لئے اور ان کی مرضی کے موافق ہو تو جنت ہمارا ٹھکانا بن جاتی ہے، اگر خدانخواستہ ہم حرص و ہوس کے پیچھے پڑ گئے تو جو کام بھی ہم سے ہوگا وہ خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہوگا، اور ہماری آخرت برباد ہو جائے گی، خوب اچھی طرح سمجھ لو، ہر کام خدائے تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرو، چاہے اس میں کتنے ہی مشکلات درپیش ہوں، یا آپ پر کیسی ہی مصیبت آ جائے، ہمیشہ خدا کی مرضی کے موافق

رہو، جو ان کو ناپسند ہو، وہ چھوڑ دو، اور ان کی رضا کو سب پر مقدم رکھو،،

(مواعظ حسنہ جلد اول، ص: ۱۵۹)

دیکھنا یہ ہے مزاجِ یار تو برہم نہیں

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ جو ایک بہت بڑے صوفی اور کامل بزرگ گزرے ہیں، ان کی ایک کتاب "منطق الطیر" کے نام سے ہے، اس میں وہ پرندوں کی زبان میں بات کرتے نظر آتے ہیں، اس کتاب کا ایک شعر یہ ہے۔

چیست اخلاص آنکہ از غیر خدا   فرد آئی در خلا ء و در ملا

یعنی ظاہر و باطن، چھپے اور کھلے خدا ہی کے لئے کرو، جس میں اور کسی کا شائبہ نہ ہو حضرت تھانویؒ سے متعلق ذکر کردہ واقعہ اور اس پر تبصرہ اور حضرت محدث دکنؒ اور حضرت شیخ عطارؒ کے نقل کردہ ملفوظات کے بعد زیرِ نظر مضمون اس شعر پر ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ؎

گو ہوا دشمن زمانہ ہو مگر اے دل ہمیں
دیکھنا یہ ہے مزاجِ یار تو برہم نہیں

دین کی فکر

کہو، یوسف کیسے ہیں؟ ——— یہ سوال حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے اس وقت کیا تھا جب یہ بیٹے مصر کے سفر سے آئے تھے اور یہ راز ظاہر ہو گیا تھا کہ گم شدہ یوسف ہلاک نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ باکرامت مصر میں موجود ہیں ——— حضرت یعقوبؑ کی بینائی اپنے چہیتے بیٹے یوسف کی مفارقت میں ضائع ہو گئی تھی۔ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو مصر سے رخصت کرتے ہوئے اپنا ایک "کرتہ" دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ پہونچنے کے بعد یہ کرتا والدِ محترم کے چہرے پر ڈال دینا اس سے ان کی بینائی عود کر آئے گی اور وہ پہلے کی طرح بینا ہو جائینگے۔

بابرکت کرتہ

یہ کرتہ عام کپڑوں کی طرح نہیں تھا بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے جنت سے اس وقت لایا گیا تھا جب ان کو برہنہ کر کے نمرود نے آگ میں ڈالا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے عارضی طور پر اس کو استعمال کرنے کے بعد اپنے پاس محفوظ رکھا۔ ان کی وفات کے بعد جنت کا یہ لباس انکے بیٹے حضرت

اسحاقؑ کے پاس محفوظ رہا۔ جب ان کا بھی وصال ہوگیا تو ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کو ترکہ میں ملا۔ حضرت یعقوبؑ نے اس متبرک کرتے کو ایک نلکی میں بند کر کے حضرت یوسف کے گلے میں بطور تعویذ ڈالدیا تاکہ وہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ لیکن جب یوسف کے بھائی یوسف کو کنویں میں ڈال رہے تھے تو اس وقت انہوں نے یوسف کے بدن پر جو کرتا تھا اسے اتار لیا تھا تاکہ وہ اس کو لے کر والد کے پاس جائیں اور جھوٹے خون سے رنگ کر یہ دھوکہ دے سکیں کہ یوسف کو بھیڑیا نے کھا لیا۔ چنانچہ برہنہ حالت میں یوسف کنویں میں ڈال دیئے گئے۔ البتہ وہ نلکی ان کے گلے میں پڑی رہی جس میں جنت کا یہ کرتا بطور تعویذ بند تھا۔ حضرت جبرئیل امین تشریف لائے اور گلے میں پڑی ہوئی اس نلکی کو کھول کر یہ کرتا برآمد کیا اور یوسف کو پہنا دیا۔ اس وقت سے یہ کرتا حضرت یوسف کے پاس برابر محفوظ رہا جب انہوں نے ایک مرحلہ پر بھائیوں کے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کردیا اور بھائیوں سے خواہش کی کہ آپ لوگ جا کر والدین اور دیگر اہلِ خاندان کو مصر لے آئیں تو اس موقعہ پر بھی جبرئیل امین ہی نے یوسف علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ یہ جنت کا لباس ہے، اس کی خاصیت ہے کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دینے سے وہ بینا ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے بھائیوں کے ذریعہ اسے والد کے پاس بھیج دیجئے وہ اس کی برکت سے بینا ہو جائیں گے اور کنعان سے مصر آتے ہیں کوئی عذر باقی نہیں رہے گا۔

باپ کا سوال بیٹے کا جواب

جب یوسف علیہ السلام نے کرتہ حوالہ کیا تو ان کے بڑے بھائی یہودا

نے کہا کہ یہ کرتہ میں لے جاؤں گا کیونکہ ان کے کرتہ پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہونچے . اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھوں ہونی چاہیے ۔ چنانچہ جب یہودا کرتہ لیکر آئے اور یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا تو وہ بینا ہو گئے اور بڑی بے تابی کے ساتھ پوچھا، کہو یوسف کیسے ہیں ؟ یوسف ، ان کا کیا پوچھنا، اللہ نے تو ان کو خوب نوازا ہے ، وہ تو مصر کے بادشاہ ہیں ۔ بڑے شفیق اور ہر دل عزیز ۔ یہودا نے جواب دیا ۔

"میں تم سے اس کو نہیں پوچھ رہا ہوں کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر؟ پوچھنا یہ ہے کہ دین و ایمان اور عمل کے اعتبار سے ان کا کیا حال ہے؟ یہ کہہ کر حضرت یعقوبؑ نے اپنے سوال کی نوعیت کی وضاحت فرمائی اور یہ بتانا چاہا کہ بیٹے یہودا یوسف کے بارے میں تمہارا یہ جواب میرے لئے اطمینان بخش نہیں ۔ مجھے تو اطمینان اس وقت ہو گا جب ان کی دینی اور ایمانی زندگی کا رنگ سامنے آئے گا ۔ چنانچہ جب یہودا نے ان کے تقویٰ و طہارت کے حالات بتائے تو اس وقت حضرت یعقوب کو اطمینان ہوا اور ان کے چہرے سے انبساط و مسرت کا نور ظاہر ہوا ۔

انبیائی مزاج

یہ ہے دراصل دینی اور انبیائی مزاج کے لوگ جو اپنی اولاد سے محبت اور تعلق ضرور رکھتے ہیں مگر صرف ان کو ظاہری اور جسمانی راحت پہونچانے کی حد تک نہیں بلکہ ان کی دینی اور روحانی حالت کی بھی فکر

کرتے ہیں اور یہ فکر پہلی فکر پر غالب رہتی ہے جس کا ثبوت سورۂ بقرہ کی آیات (۱۳۰۔۱۳۳) سے بھی ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ ہر ایک نے اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کی تھی اور اسی کا حکم بہ تاکید دیا تھا کہ میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام اور اطاعتِ حق کے لیئے تمہیں منتخب فرمالیا ہے سو تم دم مرگ تک اس کو مت چھوڑنا اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔ انہوں نے اس نصیحت کا یہی جواب دیا کہ ہم اس ذات پاک کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ کرتے آئے ہیں یعنی وہی معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے اور ہم احکام میں بھی اسی کی اطاعت پر قائم رہیں گے اور اس عہد کو انہوں نے اپنی زندگی میں بحسن وخوبی نبھایا۔

بے علمی اور بے دینی کی بڑی وجہ

آج کل مسلمانوں میں بے علمی اور بے دینی پھیلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اگر خود دین سے واقف اور دیندار بھی ہیں تو اس کی فکر نہیں کرتے کہ ہماری اولاد بھی دیندار ہو کر دائمی راحت کی مستحق ہو۔ عام طور پر ہماری نظریں صرف اولاد کی دنیوی اور چند روزہ راحت پر رہتی ہیں۔ اسی کے لیئے انتظامات کرتے رہتے ہیں، دولت لازوال کی طرف توجہ نہیں دیتے، حالانکہ مسلمانوں کے لیئے سب سے بڑا سرمایہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "کوئی والدین اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت سے زیادہ بہتر عطیہ نہیں دے سکتا۔"

آج عصری درس گاہوں میں دین و اخلاق کی تعلیم نہیں ہے اور اسے

تقریباً "شجر ممنوعہ" قرار دیا گیا ہے، ان حالات میں مسلمانوں کو بطور خود معقول نظم کرنا پڑے گا۔ جو لوگ موقتی طور پر دینی گرمائی اسکول چلا رہے ہیں ان کا یہ اقدام بڑا مستحسن ہے، ضرورت ہے کہ ایسے دینی اسکولوں سے اپنی اولاد کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے۔

گرمائی تعطیلات اور مسلم طلبہ و طالبات

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسکول اور کالج کے طلبہ و طالبات کو گرمائی تعطیلات کا شدت سے انتظار رہتا ہے، یہ لوگ بطور خود یا اپنے دوستوں ساتھیوں، سہیلیوں یا اپنے والدین اور سرپرستوں کے ساتھ سیر و تفریح، تقریبات میں شرکت اور متعدد کھیل کود کی تربیت حاصل کرنے کا مختلف نظام اور پروگرام پہلے سے تیار رکھتے ہیں، یہ سب "ذہنی آسودگی" چاہتے ہیں اور اپنے دماغ کے بوجھ اور تھکن کو اتارنا چاہتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ واقعہ میں انہیں اپنے بنائے ہوئے نظام اور پروگرام پر عمل کرنے کے بعد ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے یا نہیں، اور دماغ، بوجھ اور تھکن سے خالی ہوتا ہے یا نہیں، تاہم "قلبی اطمینان" کے حصول اور دنیاوی اور اخروی زندگی کی حقیقی بہتری کے لئے ضروری ہے کہ مسلم طلبہ اور طالبات کی عمر اور صلاحیت کے لحاظ سے گرمائی تعطیلات میں انہیں ایک مختصر مگر دلچسپ اور پُرکشش کورس کے ذریعہ دین و اخلاق اور اسلامی تہذیب و تاریخ سے روشناس کرایا جائے، استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے مختلف سطحوں اور معیارات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہلِ علم اور اصحابِ فکر کے تعاون

سے اس طرح کا مناسب اور موزوں کورس تیار کرایا جا سکتا ہے، آج کل دینی اخلاقی اور تاریخی قدروں پر مشتمل جو آڈیو اور ویڈیو کیسٹس تیار کیے گئے ہیں، ان سے بھی اس مقصد کی تکمیل میں مدد لی جا سکتی ہے، ضرورت اور حالات کے تحت مساجد، دینی مدارس، مسلم انتظامیہ کے زیر نگرانی چلنے والے تعلیمی اداروں اور دیگر موزوں جگہوں میں منظم اور منصوبہ بند طریقوں پر یہ نظم چلایا جا سکتا ہے، مسلم طالبات کے لئے علیٰحدہ اور خصوصی نظم ہونا چاہئے جس میں دینی اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ ان کے مناسب حال کھانے پکانے اور سلائی کڑھائی وغیرہ کی تربیت کا بھی جزوی طور پر معقول بندوبست ہو، اس نظام سے لوگوں کو متعارف کرانے، اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور " وندے ماترم" والے غیر دینی، غیر اسلامی بلکہ غیر جمہوری اور غیر سیکولر ماحول میں دینی، اخلاقی اور ہندوستان کے پس منظر میں جمہوری قدروں کو دل میں بٹھانے کے لئے افتتاحی اور اختتامی تقریبات کا اہتمام کیا جائے، اس موقعہ پر انعامات کی تقسیم بھی عمل میں لائی جائے، ان تقریبات میں عام مسلمانوں سے شرکت کی خواہش کے ساتھ معروف اہل دین و دانش کو بطور خاص مدعو کیا جائے اور علماء سے استفادہ کی صورت نکالی جائے۔

ہندوستان میں اسکول اور کالج کی تعلیم کا جو نصاب اور نظام ہے اس میں کم از کم گرمائی تعطیلات میں آج کے نونہال اور نوجوان جو مستقبل کے قائد اور معمار بننے والے ہیں، ان کی دینی اور اسلامی شناخت کو باقی رکھنے کے لئے یہ اجتماعی نظام اور اس کا استحکام از حد ضروری ہے، عام دنوں میں بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ کوشش جاری رہنی چاہئیں۔

انشاء اللہ اس کے بہتر اور مؤثر نتائج بر آمد ہوں گے اور عصری تعلیم کے ساتھ دینی و اخلاقی حیثیت سے بھی مسلم طلبہ اور طالبات کی سطح اونچی ہوگی۔ جو لوگ گرمائی تعطیلات میں تنظیمی، جماعتی یا انفرادی طور پر اس طرح کی کوششیں کر رہے ہیں، ان کی یہ کوششیں بلاشبہ لائق تحسین اور قابلِ قدر ہیں، ان کوششوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے، ان کوششوں سے مربوط اور مستفید ہونے کا ایک اہم اور روشن پہلو یہ بھی ہے کہ طلبہ اور طالبات کا زمانۂ تعطیلات لغویات سے محفوظ رہے گا اور اس زمانہ میں وہ اپنے دامن کو دین و اخلاق کے بیش بہا موتی سے بھر سکیں گے۔

اپنے بچوں کی دینی اور روحانی حالت کو بنانے، سنوارنے اور سدھارنے کی کس قدر فکر ہونی چاہیے، اس کا اندازہ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک تاریخی جملے سے کیا جاسکتا ہے، ان کا جملہ ہے "کہو، یوسف کیسے ہیں؟" یہ جملہ دراصل ایک سوال ہے، جسے حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹے سے اس وقت کیا تھا جب یہ بیٹے مصر کے سفر سے لوٹ آئے تھے اور یہ راز ظاہر ہوگیا تھا کہ گم شدہ یوسف ہلاک نہیں ہوئے بلکہ زندہ باکرامت مصر میں موجود ہیں، حضرت یعقوبؑ کی بینائی اپنے چہیتے بیٹے یوسف کی (۴۰) سالہ مفارقت میں ضائع ہوگئی تھی، حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو مصر سے رخصت کرتے وقت اپنا ایک کرتہ دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ پہنچنے کے بعد یہ کرتہ والدِ محترم کے چہرے پر ڈال دینا، اس سے ان کی بینائی عود کر آئے گی اور وہ پہلے کی طرح بینا ہو جائیں گے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ بینا ہوگئے، اور بینا ہوتے ہی یعقوبؑ نے بڑی بے تابی کے ساتھ پوچھا، کہو، یوسف کیسے ہیں؟ بھائیوں نے بتایا، یوسف، ان کا

کیا کہنا، اللہ نے ان کو خوب نوازا ہے، وہ تو مصر کے بادشاہ ہیں، حضرت یعقوبؑ نے فرمایا، میں تم سے یہ نہیں پوچھ رہا ہوں کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر؟ پوچھنا یہ ہے کہ دین وایمان کے اعتبار سے ان کا کیا حال ہے؟ اور جب حضرت یوسف کے تقویٰ وطہارت اور ایمان واخلاص کے حالات بتائے گئے تو حضرت یعقوب کو اطمینان ہوا اور ان کے چہرے سے انبساط ومسرت کا نور ظاہر ہوا۔

یہ ہے دراصل دینی وانبیائی مزاج کہ ایسے لوگ جو اپنی اولاد سے محبت اور تعلق تو ضرور رکھتے ہیں مگر صرف ان کو ظاہری اور جسمانی راحت پہنچانے کی حد تک نہیں بلکہ ان کی دینی اور روحانی حالت کی فکر کرتے ہیں اور یہ فکر پہلی فکر پر غالب رہتی ہے، جس کا ثبوت سورۂ بقرہ کی آیات ۱۳۲، ۱۳۳) سے بھی ملتا ہے۔ ارشاد ہے: (ترجمہ) "اور ابراہیمؑ اس کی ہدایت کر گئے اپنے بیٹوں کو (یعنی اس دین توحید کی، ملتِ اسلام کی) اور اسی طرح یعقوبؑ بھی (اپنے بیٹوں کو) کہ اے میرے بیٹو! بیشک اللہ نے تمہارے لئے دین کا انتخاب فرمایا ہے، سو ایسا ہرگز نہ ہونے پائے کہ تم مرتے وقت بجز مسلم کے کچھ اور ہو، بھلا اس وقت تم کیا موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آپہونچی اور اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ وہ بولے ہم عبادت کریں گے آپ کے اور آپ کے باپ داداؤں ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی، (اس) معبودِ واحد کی، اور ہم تو اس کے حکم بردار ہیں۔"

آج کل مسلمانوں میں بے علمی اور بے دینی پھیلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اگر خود دین سے واقف اور دیندار بھی ہوں تو اس کی

فکر نہیں کرتے کہ ہماری اولاد بھی دیندار ہو کر دائمی راحت کی مستحق ہو، عام طور پر ہماری نظریں صرف اولاد کی دنیوی اور چند روزہ راحت پر رہتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا سرمایہ ایمان اور عملِ صالح ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کوئی والدین اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت سے زیادہ بہتر عطیہ نہیں دے سکتا۔" آج عصری درسگاہوں میں دین و اخلاق کی تعلیم نہیں ہے، ان حالات میں مسلمانوں کو بطورِ خود معقول نظم کرنا پڑے گا، بصورتِ دیگر انہیں خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا، کیونکہ اس غفلت و تساہل سے حکمِ خداوندی (ترجمہ) "اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں" (التحریم ـ ۶) کی نافرمانی ہوگی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ مذکورہ آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں، "لفظ اَھْلِیْکُمْ میں اہل و عیال سب داخل ہیں، نوکر چاکر بھی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اپنے کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکامِ الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل و عیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے، ان کاموں سے ان سب کو منع کرو اور جن کاموں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے تم ان کے کرنے کا اہل و عیال کو بھی حکم کرو تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔"

حضرات فقہار نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائض شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے ——— اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دین سے جاہل و غافل ہوں ۔

(معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۵۰۲)

مسلم بچوں اور مسلم طلبہ وطالبات کے لئے دینی تعلیم کس قدر ضروری ہے ، اس کا اظہار ملک کے ممتاز اور بزرگ مفتی مولانا سید عبدالرحیم لاجپوری" نے اپنی درج ذیل تحریر میں نہایت دردمندی کے ساتھ کیا ہے ، حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

" ایک عربی شاعر نے بہت خوب کہا ہے ،

لَیْسَ الْیَتِیْمُ الَّذِیْ قَدْ مَاتَ وَالِدُہٗ

اِنَّ الْیَتِیْمَ یَتِیْمُ الْعِلْمِ وَالْاَدَبِ

یعنی یتیم صرف وہ بچہ نہیں ہے جس کے والد کا انتقال ہوگیا ہو (بلکہ) یتیم وہ بھی ہے جو علم وادب سے محروم رہا ہو ۔

ہمارے ذہنوں میں صرف یہ بات ہے کہ بچپن میں جس بچہ کے والد کا انتقال ہوگیا ہو ، وہ بچہ یتیم ہے مگر شاعر یہ کہتا ہے کہ وہ بچہ بھی یتیم ہے کہ جس کا باپ زندہ ہے مگر وہ بچہ کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتا اور اس کو علم وادب سے محروم رکھا ہے ، بچہ میں نہ نماز کا شوق پیدا ہوا ، نہ قرآنِ پاک کی تلاوت کی طرف توجہ پیدا ہوئی ، بچہ نہ مدرسہ جاتا ہے نہ دوسرے اسلامی آداب کا

اسے علم ہے، نہ بڑوں کا ادب واحترام جانتا ہے تو اس بچہ کے حق
میں باپ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، وہ بچہ بھی شاعر کی نظر میں یتیم ہے،
اس لئے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینا اور علم دین سکھانا اور اسلامی
آداب سے مزین کرنا بہت ضروری ہے اور والدین پر اس کی بہت
بڑی ذمہ داری ہے، جس نے اپنی اولاد کو دنیا اور آخرت کے بہت
بڑے خیر سے محروم رکھا، قیامت میں باپ سے اولاد کے متعلق سوال کیا
جائے گا "مَاذَا عَلَّمْتَهُ وَمَاذَا اَدَّبْتَهُ" تم نے بچہ کو کیا تعلیم
دی اور کیسا ادب سکھایا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "کسی باپ نے اپنی
اولاد کو اچھے ادب سے بہتر کوئی عطیہ (تحفہ) نہیں دیا" (ترمذی)۔
آپ کا یہ بھی ارشاد ہے "مرد کا اپنے بچہ کو ادب سکھانا ایک صاع
(تقریباً ساڑھے تین کلو) غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے" (ایضاً)
اللہ کی رحمت کی قدر کیجئے۔ آپ اپنے بچہ کو ایک ادب سکھائیں گے
اس پر بھی آپ کو اجر و ثواب ملتا ہے"

(فتاویٰ رحیمیہ جلد ۱۰، اقتباس صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۶)

ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے عصری اور انگریزی تعلیم
کو اہمیت کے ساتھ پیش کرنے والے اولین لوگوں میں
سرسید احمد خاں مرحوم کا نام سرفہرست ہے، انہوں نے اپنے "مدرسۃ
العلوم" (جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا) کی بنیاد
میں دینی اور مذہبی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی تھی، اس کے لئے ایک
عالم دین کو استاذ کی حیثیت سے مقرر بھی کیا تھا، سرسید نے اپنے

اس تعلیمی سفر کے آغاز ہی میں کہا تھا "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ "لآ الٰہ الاّ اللہ محمّد رسول اللہ" کا تاج سرپر۔" (موجِ کوثر صفحہ ۱۴۶)

انہوں نے ایک دفعہ اپنی تقریر میں مدرسۃ العلوم کے طالبِ علموں کو مخاطب کرکے یہ بھی کہا تھا "یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لآ الٰہ الاّ اللہ محمّد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم، قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونہ ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہو گی۔" (حیاتِ جاوید صفحہ ۲۱۵)

سرسید لڑکوں کی دینی تعلیم کے ساتھ لڑکیوں کی دینی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے، نیز وہ اپنی تمامتر روشن خیالی کے باوجود عورتوں کے پردہ کے بارے میں مثبت اندازِ فکر رکھتے تھے جس کا اندازہ مولانا الطاف حسین حالی کی درج ذیل عبارت سے ہو سکے گا:۔

"مستورات کے پردہ کی نسبت ان کی رائے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بالکل برخلاف تھی، وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی عورتیں منھ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں، ایک دفعہ شاید" مولوی عبدالحلیم شرر" نے اپنے اخبار میں ان کی نسبت لکھ دیا تھا کہ وہ پردے کے مخالف ہیں، اس پر منشی سراج الدین نے ان سے اس باب میں ان کی رائے دریافت کی، سرسیّد ان کے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔" میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرفدار ہوں اور

بالتخصیص ہندوستان میں اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے، نہ میں نے اس پر کبھی غور کیا، مگر فقہاء اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منھ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں، فقہائے متأخرین نے بسبب فسادات زمانہ کے منھ کو بھی پردہ میں داخل کیا ہے، مولوی شرر نے میری نسبت غلط لکھدیا ہے۔"

(حیاتِ جاوید صفحہ: ۷۷۳)

مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" ہی میں صفحہ (۶۴۴) پر جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے بھی ظاہر ہے کہ سرسید انگریزوں سے دوستانہ تعلقات اور میل جول کے بہت زیادہ خواہشمند تھے مگر انگریز اس راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ "پردہ" کو سمجھتے تھے، انگریزوں کے اس عذر کو رفع کرنے اور اپنی دلی خواہش کی تکمیل میں سرسید کے لئے یہ آسان تھا کہ وہ یہ کہتے، موجودہ حالات کا تقاضہ ہے کہ پردہ کی قید کو اٹھا دیا جائے، یہ بہت ناروا ہے، اس کی وجہ سے بہت ساری رکاوٹیں پیش آرہی ہیں اور مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی ترقی کے لئے یہ مانع ہے مگر اپنی تمامتر روشن خیالی کے باوجود انہوں نے ایسا نہیں کیا اور پردہ کے "شرعی حکم" کو انگریزوں کی "مزاج داری" کے مقابلے میں ترجیح دی، مولانا حالی نے اس ضمن میں یہ تبصرہ خوب کیا ہے کہ "حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول ہونا غیر ممکن ہے، جن میں سے ایک قوم کا مردانہ سوسائٹی میں شریک ہونا اس کے لئے باعثِ عزت سمجھا جاتا ہے اور دوسری قوم میں باعثِ شرم۔"

(اقتباس ختم)

دین و ملت کے ہمدرد، عظیم اور حکیم شاعر اکبر الہ آبادی کا ایک

منظوم مکتوب "کلیاتِ اکبر" میں ان کے بیٹے کے نام ہے، یہ مکتوب بھی اس لائق ہے کہ اس موقع پر اسے نگاہ کی راہ سے دل میں اتار لیا جائے، وہ فرماتے ہیں: ؎

لندن کو چھوڑ لڑکے اَب ہند کی خبر لے
بنتی رہیں گی باتیں آباد گھر تو کر لے،

راہ اپنی اَب بدل دے بس پاس کر کے چل دے
اپنے وطن کا رخ کر اور رخصتِ سفر لے،

انگلش کی کر کے کاپی دنیا کی راہ ناپی
دینی طریق میں بھی اپنے قدم کو دھر لے

نیچر پکارتا ہے "ہے اصل نسل تیری
کہتی ہے ہسٹری بھی بس جا اور اپنا گھر لے

واپس نہیں جو آتا کیا منتظر ہے اس کا
ماں خستہ حال ہو لے، بیچارہ باپ مر لے

مغرب کے مرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ
پیرانِ مشرقی سے اَب فیض کی نظر لے،

میں بھی ہوں اک سخنور آ سُن کلامِ اکبرؔ
ان موتیوں سے آکر دامن کو اپنے بھر لے

اکبر الٰہ آبادی ہی کے ایک معنی خیز اور حقیقت افروز قطعہ پر اس مضمون کو ختم کیا جا رہا ہے ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ میں جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

سیرتِ نبوی سے بے خبری کا عبرت خیز واقعہ

"سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر"

وہ لوگ جو رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتے ہیں، اخبارات پڑھتے ہیں اور ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اسٹار ٹی وی کے ایک پروگرام نے آجکل بڑی شہرت حاصل کر لی ہے بچہ بچہ کی زبان پر اس پروگرام کا نام ہے اور لوگ نہایت شدت اور بے چینی کے ساتھ اس ہفتہ واری پروگرام کا انتظار کرتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس پروگرام کے بانی، موجد اور سربراہ امیتابھ بچن بڑی خوبی، دل کشی اور کمال کے ساتھ اس پروگرام کو پیش کرتے ہیں، اور لوگ اسے مسحور اور مسرور ہو کر دیکھتے ہیں، پروگرام کا نام یا عنوان ہے "کون بنے گا کروڑپتی؟"

راقم الحروف کو اس وقت اس پروگرام کے حسن و قبح اور اس کی شرعی، فقہی اور اخلاقی حیثیت پر کچھ عرض کرنا نہیں ہے، بلکہ اس پروگرام کے پس منظر میں ایک واقعہ بیان کرنا ہے، جس میں دیدۂ عبرت نگاہ کے لئے عبرت کا ہزارہا سامان موجود ہے۔

جس وقت (۱۸ مئی ۲۰۰۱ء روز جمعہ) یہ تحریر لکھی جا رہی ہے۔ اس سے ایک روز قبل ایک ممتاز صحافی نے ٹیلیفون کی گفتگو میں جنرل نالج سے متعلق اس انعامی سوال و جواب کے پروگرام کے بارے میں نہایت قلق، بلکہ کرب کے ساتھ بتایا کہ ایک مسلمان سے جب امیتابھ بچن نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا نام دریافت کیا، تو وہ فوراً یا قدرے توقف کے بعد بھی چار امکانی جوابات میں صحیح جواب کا انتخاب نہ کر سکا، بلکہ ایک ذہنی کرب میں مبتلا محسوس ہو رہا تھا، امیتابھ بچن نے کئی مواقع دئے اور عملاً صحیح جواب ان کی زبان سے ادا کرنے کی

کوشش کی، جس کے باعث وہ اٹکل کے طور پر یہ جواب دیا جو صحیح تھا۔ تفصیلات کے بموجب ایرلائنس کے ملازم محمد عرفان سے امیتابھ بچن نے یہ سوال کیا کہ یہ بتائیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام کیا ہے؟ عبدالمطلب، ابوطالب، عبداللہ، ابوبکر۔ دوبارہ، سہ بارہ سوال کے بعد بھی محمد عرفان خاموش رہے۔ امیتابھ بچن نے جواب میں آسانی کی خاطر چار نام میں سے دو کو حذف کر کے دو نام رکھے، ابوطالب، یا عبداللہ؟ مگر محمد عرفان بدستور خاموش رہے اور ان سے صحیح جواب عبداللہ اتفاقاً ہی حاصل ہوا۔

میرے خیال میں یہ معاملہ صرف ایرلائنس والے محمد عرفان کا ہی نہیں ہے، بلکہ مسلم سماج میں بہت سے محمد عرفان مل جائیں گے، جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتے ہیں، وہ دین کی بنیادی باتوں سے بھی بے خبر ہیں، چند سال پیشتر کی بات ہے کہ شارجہ ٹیلی ویژن نے رمضان المبارک کے خصوصی پروگرام میں مسلم حاضرین میں سے ایک سے سوال کیا کہ قمری اسلامی مہینوں میں سے نویں مہینہ کا نام کیا ہے؟ اور محرم سے ذی الحجہ تک کے قمری مہینوں کے نام ترتیب کے ساتھ بتائیے۔ مگر جن سے سوال کیا گیا تھا، وہ مبہوت اور بے خبری کی تصویر بنے رہے، جب کہ یہی مسلمان اور ان کے بچے مشہور کرکٹ کھلاڑیوں کے نام بغیر سوچے سمجھے برجستہ بتاتے ہیں، کس کرکٹ کھلاڑی نے کتنے رن اب تک بنائے ہیں، یہ اعداد و شمار بھی بلا کسی رکاوٹ کے چوّے چھکے اور سنچری کی تفصیل کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں، کسی فلمی گانے کے آگے پیچھے حصے کو کاٹ کر بیچ کا تھوڑا سا حصہ دیا جاتا ہے تو جواب فوراً حاضر کر دیا جاتا ہے کہ یہ گانا فلاں فلم کا ہے اور فلاں نے فلاں موقع پر گایا ہے، اس سلسلہ میں ذہنی استحضار کا یہ عالم ہے کہ کسی پرانی فلم کا درمیانی حصہ دے کر فلم کا نام پوچھا جاتا ہے اور کیا مجال کہ حافظہ خطا کرے۔ اسی طرح دنیا کے دوسرے معاملات میں ہماری فکر، جستجو، دلچسپی اور انہماک مثالی ہے، یہاں وہاں اِدھر اُدھر کی معلومات کی دنیا ہے جو اپنے ذہن و دماغ میں ہم بسائے ہوئے ہی نہیں، بلکہ سجائے اور سنوارے ہوئے

ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں کچھ اور لکھنا چاہتے ہیں، مگر جگرؔ کہتے ہیں کہ بات اس پر ختم کر دیجئے : ؎

با ہمہ ذوقِ آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام جائز حدود میں رہتے ہوئے اپنے ماننے والوں کو تعلیمی و معاشی اور دنیوی ترقیوں کی سمت قدم آگے بڑھاتے رہنے کی نہ صرف زبانی طور پر تلقین کرتا ہے، بلکہ عملی حیثیت سے راہیں بتاتا اور دست و بازو کو قوتِ پرواز عطا کرتا ہے، مگر یہ بھی کہتا ہے کہ تم اپنے دین، خدا اور نبیؐ سے وابستہ رہو، مسلمان ہونے کے لئے جن بنیادی باتوں کی ضرورت ہے، ان سے آگاہ اور آشنا رہو، شجر سے وابستہ رہنے ہی پر امیدِ بہار رکھی جا سکتی ہے۔

جہاں تک تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرِ مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کا ہے، تو طبرانی کی ایک حدیث :

ادبوا اولادکم علی ثلاث خصال : حب نبیکم وحب آل بنیه وتلاوة القرآن فان حملة القرآن فی ظل عرش الله یوم لا ظل الا ظله مع انبیائه واصفیائه۔

سے واضح طور پر یہ حکم معلوم ہوتا ہے کہ والدین اور سرپرستوں کو چاہئے کہ وہ بچوں کو ابتدائی اور بنیادی طور پر تین باتوں کی تعلیم دیں (۱) نبیؐ کی محبت (۲) آل بیتؓ کی محبت (وسیع تر معنیٰ و مفہوم میں جس کی وجہ سے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسینؓ حضرت حسنؓ اور ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ صحابۂ کرامؓ اور صالحین بھی شامل ہو جاتے ہیں) اور (۳) تلاوتِ قرآن کا جذبہ و شوق۔ اس تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ جب بچہ بڑا ہوگا تو زندگی کے کسی مرحلہ میں کوئی نظریہ اور کوئی شخص اس کا "ذہنی اغوا" نہیں کر سکتا۔

سب جانتے ہیں کہ طوفان سے وہی گھر اور درخت متاثر ہوتا ہے جس کی بنیاد اور جڑ مضبوط اور مستحکم نہیں ہوتی۔ اگر بچوں کی اٹھان اور نشو ونما اسلامی خطوط اور دینی بنیادوں پر ہو تو اسلام، دین اور سیرتِ نبویؐ سے متعلق ہر ضروری سوال کا جواب وہ اپنی طفلانہ زندگی اور بزرگانہ دور دونوں میں آسانی کے ساتھ دے سکتے ہیں، اس کے لئے توجہ، دلچسپی اور فکر و اہتمام کی ضرورت ہے۔

آخر میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت جس قدر قوی ہوگی آپؐ سے محبت بھی اسی قدر شدید ہوگی، معرفت کی کمی سے آپؐ کی محبت میں کمی واقع ہوگی، معرفت کے حصول کے لئے سیرتِ نبویؐ سے متعلق کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں کتابیں موجود ہیں، آپؐ کی سیرت سے متعلق مستند کیسٹس بھی دستیاب ہیں۔ بہرحال محمد عرفان کا مذکورہ بالا واقعہ ایک "لمحۂ فکریہ" ہے، اس واقعہ کے پس منظر میں "عرفانِ نبیؐ" کے حصول کا جذبۂ بے کراں ابھرنا چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ ؎

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے
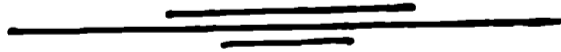
چھینک یادِ الٰہی کا ایک ذریعہ

اسلامی آداب کی جلوہ طرازیوں پر ایک نظر

"ابوداؤد! آج تم نے تین درہم میں جنت خرید لی"۔ محدث کبیر حضرت امام ابوداؤد (۲۰۲ـ ۲۷۵ھ) کے کان میں ایک موقع پر غیب سے یہ آواز آئی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن امام ابوداؤدؒ دریا کے کنارے کھڑے تھے، اور کنارے پر پانی کم تھا، ایک جہاز دو تین سو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا، کنارے پر آ نہیں سکتا تھا، جہاز میں ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے "الحمدللہ" کہا اور اتنے زور سے کہا کہ ان کے کان میں آواز آئی، اس کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں وہ حدیث تازہ ہوگئی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "یرحمک اللہ" سے جواب دینے کا حکم فرمایا ہے، لیکن ظاہر ہے اس حکم کا تعلق مجلس سے ہے، یہ نہیں کہ اگر کوئی بازار میں الحمدللہ کہے تو گھر سے جواب دینے کے لئے جایا جائے، مگر یہ لوگ نیکیوں کے حاصل کرنے میں اس قدر پیش پیش رہتے تھے کہ اس سلسلہ میں ادنیٰ درجہ کی غفلت کو راہ نہیں دیتے تھے، بلکہ اس کے حصول کے لئے بہانہ تلاش کرتے تھے، چنانچہ الحمدللہ کی آواز کان میں آتے ہی امام ابوداؤدؒ کے اندر نیکی اور خیر

کو حاصل کرنے کا شدید جذبہ پیدا ہوا، جہاز دور ہونے کی وجہ سے یہ خیال آیا کہ میرے جواب (یرحمک اللہ) کی آواز وہاں تک نہیں پہونچ سکتی ہے، تو تین درہم میں کشتی کرایہ پر لی، بیٹھ کر وہاں پہونچے، جہاز پر چڑھے اور فرمایا "یرحمک اللہ" پھر واپس ہو گئے۔

تین درہم میں جنت

واقعہ نگار نے لکھا ہے کہ اس عمل کے بعد غیب سے کان میں آواز آئی "اے ابوداؤد! آج تم نے تین درہم میں جنت خرید لی" — حالانکہ امام نے کتنی حدیثیں لکھیں، کتنے تہجد پڑھے، اور کتنے جہاد کئے ہوں گے، مگر جنت کی خریداری کے لئے بڑے اعمال کا ذکر نہیں بلکہ آیا تو یرحمک اللہ کا جو بظاہر معمولی عمل ہے، کیوں آیا؟ اس لئے کہ کشتی لے کر جہاز پر جانا اور یرحمک اللہ کہنا نہ موقع کے لحاظ سے ان پر اس وقت فرض تھا نہ واجب، مگر یہ لوگ آداب پر عمل کے حریص (حد درجہ مشتاق) تھے، تاکہ فرائض پر عمل میں کوتاہی نہ آئے اور اس وقت امام ابوداؤد کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ جنت کا فیصلہ فرما دیا۔

طبعی اعمال میں شریعت کا پاس و لحاظ

یہ ایک واقعہ ہے کہ خالقِ کائنات کی جانب سے انسان کی طبیعت اور سرشت میں بعض چیزیں ایسی داخل کر دی گئی ہیں کہ ان کا صدور اور ظہور انسان سے ہوتا رہتا ہے، اس طرح کے طبعی اعمال

میں صاحبِ شریعت انسان، شرعی احکام کا پاس ولحاظ رکھے تو اس سے اس کا مقام و مرتبہ بلند ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے وہ نوازا جائے گا۔ مثال کے طور پر چھینک، جماہی، ڈکار، اور انگڑائی یہ سب انسانی طبیعت کی خاصیتیں ہیں، اگر ان میں شرعی ہدایات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی رعایت کرلی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں اجر و ثواب کا مستحق نہ ہو، بظاہر اس طرح کی باتیں چھوٹی نظر آتی ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے' اور تجربہ سے ثابت ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا لحاظ رکھتے ہیں وہ بڑی بڑی باتوں کا بھی خیال رکھ سکتے ہیں، چھوٹی باتوں سے غفلت بڑی باتوں سے بے اعتنائی کا سبب بنتی ہے، اسی پسِ منظر میں امام ابوداؤد کا مذکورہ واقعہ موعظت و نصیحت کا ایک جلی عنوان ہے:

چھینک کی حقیقت

جہاں تک تعلق چھینک کی حقیقت کا ہے تو اس کی جو بھی حقیقت ہو اور اہلِ لغت (فرہنگ آصفیہ دیکھئے) سائنسداں اور اطباء (روزنامہ سیاست حیدرآباد ۸ر جولائی اور ۱۵ر جولائی ۱۹۹۶ء ملاحظہ کیجئے) اس سلسلہ میں جس طرح کی بھی معلومات فراہم کرتے ہوں، بظاہر شریعت و سنت سے ان کا تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہے' البتہ قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ اس عمل (چھینک) کے بعد شریعت اور سنت میں کیا ہدایات ملتی ہیں؟ ابھی اوپر امام ابوداؤدؒ سے متعلق جس واقعہ کا بیان ہوا ہے' اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ چھینکنے والے کو "الحمد للہ" (ساری تعریف اللہ کے

لئے ہے (اور ہر اعتبار سے اسی کا شکر بجا لانا چاہئے) اور سننے والے کو "یرحمک اللہ" (یعنی یہ چھینک تمہارے لئے خیر و برکت کا ذریعہ بنے) کہنا چاہئے، یہ ایک عمومی .... ہدایت ہے، بعض حدیثوں میں مزید تفصیلات ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب چھینک آئے تو، الحمد للہ کہے، اور اگر رب العالمین بھی بڑھا دے، یعنی الحمد للہ رب العالمین کہے تو بہتر ہے، جب کہ الحمد للہ علیٰ کل حال کہنا بہت ہی بہتر ہے، ابن ابی شیبہؒ نے اپنی کتاب "مصنف" میں حضرت علی سے یہ نقل کیا ہے کہ جس شخص کو چھینک آئے اور وہ یوں کہے :۔ الحمد للہ رب العالمین علیٰ کل حال تو وہ ڈاڑھ اور کان کے درد میں کبھی مبتلا نہ ہوگا، علماء نے چھینک آنے پر الحمد للہ کہنے کی یہ حکمت بیان کی ہے، چھینک دراصل ذہن و دماغ کی صحت و صفائی اور مزاج و طبیعت میں نشاط و توانائی کی علامت ہوتی ہے، اور یہ چیز صحت و تندرستی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اور ظاہر ہے کہ حصولِ نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا ہی چاہیئے۔

چھینک ــ حضرت شاہ ولی اللہ کی تشریح

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، اسی لئے ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چھینک اللہ رب العزت کی جانب سے ہے، اس لئے اسے روکنا نہیں چاہیئے، چھینک کے موقع پر الحمد للہ کہنے کی ایک نرالی حکمت ایک ممتاز عالم

اور بزرگ (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) نے یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں بنایا ہے، مگر جب اسکو چھینک آتی ہے تو اس وقت اس کی شکل بگڑ جاتی ہے، چونکہ چھینک کے بعد شکل اپنی حالت پر واپس آجاتی ہے اور اس کا بگاڑ ختم ہو جاتا ہے اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ الحمد للہ کہو تاکہ اللہ کی عظیم نعمت جو تم سے خواہ ایک آن کے لئے ہی سہی مگر چھین لی گئی تھی، اور اب لوٹا دی گئی ہے، اس پر تمہاری طرف سے "شکر" ادا ہو سکے، بعض اہلِ نظر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک گھڑی ہی کے لئے سہی تاہم چھینک کے وقت سانس کی رفتار میں فرق آتا ہے، ایک بندہ اس کے بعد الحمد للہ کہہ کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اگر آپ اس موقع پر سانس کی رفتار کو بالکل روک کر میری زندگی کو ختم کر دیتے تو یہ بالکلیہ آپ کے اختیار میں تھا مگر آپ نے دوبارہ سانس کی رفتار کو پہلی حالت میں کر دیا، یہ آپ کا بہت بڑا احسان اور انعام ہے جس پر ہم جتنا شکر ادا کریں کم ہے یعنی

ع ہر سانس کے آنے جانے میں کیا ایک نیا پیغام نہیں

چھینک کا جواب

یہ تو چھینکنے والے کے لئے "الحمد للہ" کہنے کی تفصیل ہوئی، جہاں تک تعلق "یرحمک اللہ" کے ذریعہ سننے والے کے جواب کا ہے تو ایک حدیث میں اسے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر "حق" بتایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب واجب ہے، جس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، بہتر تو یہی ہے کہ ہر سننے والا الگ الگ جواب دے

تاہم حاضرین میں سے کسی ایک نے جواب دے دیا تو سب کی طرف سے کافی ہے۔ اس سے جواب کا وجوب ساقط ہو جائے گا، بعض علماً نے جواب کو فرض اور بعض نے سنت کہا ہے، شرح السنہ میں ایک حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ چھینکنے والے کو چاہئے کہ وہ "الحمدللہ" بلند آواز سے کہے تاکہ اہلِ مجلس سن لیں اور وہ جواب کا مستحق ہو، اگر چھینکنے والے نے الحمدللہ نہیں کہا تو حدیث نبوی کے بموجب وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا۔ اسی طرح اس نے الحمدللہ تو کہا لیکن اتنی آہستہ آواز سے کہ کسی نے بھی نہیں سنا تو اس صورت میں بھی جواب دینا لازم نہیں ہوگا، حضرت مکحولؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص کو مسجد کے ایک کونے میں چھینک آئی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس چھینک کی آواز سنی تو فرمایا یرحمك الله ان كنت حمدت الله یعنی اگر تو نے اللہ کی حمد کی ہے تو تجھ پر اللہ اپنی رحمت نازل کرے۔ امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ اگر تمہارے کان میں دیوار کے پیچھے سے کسی کے چھینکنے اور الحمدللہ کہنے کی آواز آئے تو اس کو بھی جواب دو یعنی یرحمک اللہ کہو۔

اگر کسی شخص کو زکام وغیرہ کی وجہ سے لگاتار چھینک آتی رہے تو اس کے جواب میں تین چھینکوں تک یرحمک اللہ کہنا تو واجب یا سنت ہوگا، اس کے بعد سکوت اور جواب کے درمیان اختیار ہوگا چاہے تو تین مرتبہ کے بعد جواب نہ دے جو رخصت یعنی شریعت کی طرف سے آسانی ہے اور چاہے تو تین مرتبہ کے بعد بھی جواب دیتا رہے جو مستحب ہے، گویا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ تین مرتبہ کے بعد

جواب دینا کوئی ناجائز بات نہیں ہے لیکن واجب وسنت مؤکدہ بھی نہیں ہے، البتہ اس سلسلہ میں ایک بات رہ گئی، وہ یہ کہ الحمدللہ کا جواب جس شخص نے یرحمک اللہ سے دیا ہے، چھینکنے والے کو چاہیئے کہ جواب دینے والے بھائی کو یھدیکم اللہ ویصلح بالکمؕ کہے یعنی اللہ تمہیں سیدھے راستے پر چلائے، اور تمہارے دل یا تمہارے احوال کو درست فرما دے، اگر غیر مسلم کو چھینک آئے تو ایک مسلمان یرحمک اللہ کی بجائے یھدیکم اللہ ویصلح اعمالکم ہی کے ذریعہ ہدایت اور اصلاحِ حال کی اس کو دعا دے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کا ثبوت ملتا ہے۔

نبی کریمؐ کے چھینکنے کا انداز اور دوسرے آداب

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب چھینکتے تو اپنے چہرہ مبارک کو اپنے ہاتھوں یا اپنے کسی کپڑے سے ڈھانک لیتے تھے اور اپنی چھینک کی آواز کو پست کر لیتے (ترمذی)، شارحین نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چھینکتے وقت چہرے کو ڈھانک لینا اور بلند آواز سے نہ چھینکنا، یہ دونوں چیزیں تہذیب وشائستگی کی علامت بھی ہیں اور آدابِ شریعت کا تقاضا بھی، کیونکہ ایک تو چھینک کے ذریعہ عام طور پر دماغ کا فضلہ وبلغم وغیرہ ناک یا منہ سے نکل پڑتا ہے، دوسرے چھینکتے وقت چہرہ کی ہیئت بگڑ جاتی ہے، اس لئے چہرے کو ڈھانک لینا چاہیئے، اسی طرح زیادہ زوردار آواز کے ساتھ چھینکنے کی صورت میں بسا اوقات لوگ چونک

اٹھتے ہیں اور ویسے بھی زیادہ بلند آواز اور بے ساختہ آواز سے چھینکنا طبیعت کی سلامتی اور شخصی وقار کے خلاف سمجھا جاتا ہے، لہذا ہلکی آواز کے ساتھ چھینکنا حسنِ ادب سمجھا گیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ چھینکنے والے کے لئے مستحب ہے کہ اپنی چھینک کو پست آواز میں رکھے اور الحمدللہ بلند آواز میں کہے تاکہ لوگ سن کر جواب دیں۔ نماز میں اگر چھینک آجائے تو الحمدللہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر بھول سے کہہ دیا تو "الحمدللہ" کے قرآنی الفاظ ہونے کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوگی، قصداً کہا تو گویا بہتر نہیں ہے، لیکن اس صورت میں نماز فاسد نہیں ہوگی کیونکہ یہ فی الجملہ قرآن مجید ہی کا ایک ٹکڑا ہے، البتہ "یرحمک اللہ" کہنے سے خواہ بھول سے ہو یا دانستہ طور پر نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ یرحمک اللہ قرآن کے الفاظ نہیں ہیں۔

چھینک اور بدشگونی

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض لوگ چھینک سے بدشگونی لیتے ہیں۔ اگر کسی کام کا ارادہ کیا یا سفر کے لئے نکلے اور اسی وقت کسی کو چھینک آگئی تو سمجھتے ہیں کہ کام حسب منشاء نہیں ہوگا اور ناکام ہو جائیں گے، سفر بھی کامیاب نہیں ہوگا اور نقصان اٹھانا پڑے گا، اس قسم کے اور بھی وسوسے، توہمات اور فرسودہ خیالات ہیں۔ اس سلسلہ میں فرہنگ آصفیہ میں دو شعر نقل کئے گئے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ پہلا شعر ہے:

چھینکت نہائے، چھینکت کھائے، چھینکت سوئے رہئے
چھینکت پر گھر نہ جائے، چاہے سرب سونے کی ہوئے

دوسرا شعر ہے ؎

مت جاؤ نثار اس سے ملاقات نہ ہوگی
ہوتی ہے جب ہی چھینک جب ہی گھر سے جاؤگی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع اور حالات کے لحاظ سے اچھے نام وغیرہ سے نیک شگونی کی تو اجازت دی ہے، مگر کسی چیز سے بدشگونی لینے سے منع فرمایا ہے، آپ کے ایک ارشاد سے واضح ہے کہ کسی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرے اور پھر کسی چیز کو بدشگونی سمجھ کر اس کام سے باز رہے، آپؐ کے متعدد فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عقیدہ میں بگاڑ اور شرک کے لئے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہیکہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسی چیز کو دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے (یعنی ایسی چیز جس کے ذریعہ شگونِ بد لیا جاتا ہے اور جو دل و دماغ میں وہم وخلجان پیدا کرتی ہے)، تو چاہیے کہ یہ دعا ر پڑھے اَللّٰھُمَّ لَا یَأْتِیْ بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا یَدْفَعُ السَّیِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ (ترجمہ: اے اللہ! اچھائیوں اور برائیوں کا لانے والا صرف تو ہے اور صرف تو ہی برائیوں اور خرابیوں کو دور کرنے والا ہے اور برائی سے منہ موڑنے اور نیکی کی طرف آنے کی توفیق و طاقت اللہ ہی کی طرف سے ہے)، اس دعا سے وہم وخلجان انشاءاللہ دور ہوگا، سکون و قرار آئے گا' اور ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کو موثر حقیقی

جانتے اور نفع ونقصان کا مالک سمجھتے ہوئے کسی کام سے رکنے کی بجائے اسے کرنے کی ہمت آئے گی۔

بہرحال یہ ایک ذیلی مسئلہ آگیا، تاہم غور کی بات یہ ہے کہ چھینک کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جن تعلیمات وہدایات کا ابھی آپ نے مطالعہ کیا ہے، اس نے چھینک کو اللہ رب العزت کی کتنی یاد اور کتنی رحمتوں کا وسیلہ اور ذریعہ بنا دیا ہے۔ بلاشبہ اسلام کی یہ بڑی خوبی اور کمال ہے۔

جمہائی

چھینک کے مقابلہ میں جمہائی ہے، عام طور پر لوگ جمائی بولتے اور لکھتے ہیں لیکن فرہنگ آصفیہ کے بموجب اصل لفظ جماہی یا جمہائی ہے اول الذکر دہلی والے اور ثانی الذکر پورب والے استعمال کرتے ہیں، منہ کھول کر سانس لینے کو کہتے ہیں؛ اس موقع پر آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے، اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، یہ نہایت کاہلی اور سستی کی علامت ہے، چھینک تو رحمان کی جانب سے ہے مگر جمہائی میں شیطان کا عمل دخل ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان جمہائی لیتا ہے تو شیطان اس پر ہنستا ہے (بخاری) دوسری حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کسی کو جمہائی آئے تو چاہیے کہ حتی الامکان اسے روکے اور اپنا ہاتھ رکھ کے منہ بند کر لے، کیونکہ شیطان داخل ہو جاتا ہے۔(مسلم)

چونکہ جمہائی لینے میں آدمی کا منہ بدنما انداز میں کھل جاتا ہے اور مکروہ

آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی شکل بدل کر ایک بدنما ہیئت ہو جاتی ہے۔ ان چیزوں کے انسداد کے لئے آپ نے جماہی کے وقت منہ پر ہاتھ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے، عام حالات میں بائیں ہاتھ کی پشت سے کام لینا چاہیئے، نماز میں اولاً اسے ہر طرح روکے، حالتِ قیام کی صورت میں داہنے ہاتھ کی پشت یا آستین منہ پر رکھ لینا چاہیئے، کھلا چھوڑے رکھنا مکروہ ہے۔ (فتاوی عالمگیری)، حدیث میں جماہی کے وقت شیطان کے داخل ہونے کا جو ذکر ہے اس سلسلہ میں شارحین نے لکھا ہے کہ اس سے اس کا حقیقی داخلہ بھی مراد ہو سکتا ہے جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے، اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی حالت میں شیطان کو وسوسہ اندازی کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی شرح یہ کی ہے کہ جب جماہی لیتے وقت آدمی کا چہرہ پوری طرح کھل جاتا ہے تو شیطان کسی مکھی، مچھر جیسی چیز کو اڑا کر منہ میں داخل کر دیتا ہے، واللہ اعلم۔

انگڑائی اور ڈکار

رہ گئی بات انگڑائی اور ڈکار کی، تو مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سیرۃ النبی" میں لکھا ہے کہ "ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جماہی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری

میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور تضعیف و تردید نہیں کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے، بہرحال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے، اس لئے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنی چاہئے۔

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے ڈکار لی تو آپ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو، کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں، وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے، اس حدیث سے پرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے۔" (سیرت النبیؐ جلد ۶، صفحہ ۸۶۷، ۸۶۶)

اسلامی آداب کے فوائد و برکات

چھینک، جمہائی، ڈکار اور انگڑائی کے سلسلہ میں اوپر جن اسلامی آداب کا ذکر کیا گیا ہے، وہ نہایت سائنٹیفک اور حکیمانہ ہیں، ان پر عمل سے اخروی حسنات کے ساتھ دنیوی برکات بھی حاصل ہوں گی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی مذکورہ کتاب سیرۃ النبی ہی میں (جلد ۶ صفحہ ۸۶۹) اسلامی آداب کے فلسفہ پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے حوالہ سے اپنے الفاظ اور انداز میں بڑی قیمتی باتیں لکھی ہیں، جی چاہتا ہے کہ اس کا ایک پیراگراف نقل کرتے ہوئے زیر نظر مضمون کو ختم کیا جائے، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ

دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسولِ انام علیہ السلام کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں، اور مذہبی اخلاقی تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار، اور طریقِ زندگی کی ہدایت، نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے "
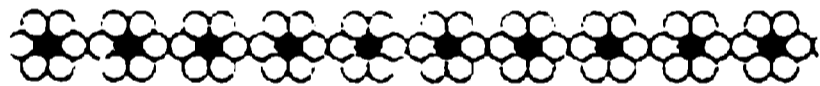
تعزیت کا اسلامی طریقہ

تعزیت' عربی زبان کا لفظ ہے' اہلِ لغت نے ان الفاظ سے اس کا ترجمہ کیا ہے' تسلی دینا، صبر دینا، ماتم پرسی کرنا، پرسا دینا، غم میں شریک ہونا۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں ہے، کسی کے مرنے پر صبر کی تلقین اور اظہارِ ہمدردی کرنا۔ فارسی اور ہندی میں اسے سوگ کہتے ہیں' تعزیت اور سوگ کے مقابلہ میں عربی اور اُردو میں جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ "تہنیت" ہے۔ جس کے معنی خوشی اور مسرت کے موقع پر مبارک باد دینے کے ہیں۔ قومی، ملکی اور سماجی روایات اور مذہبی تصورات و نظریات کے پسِ منظر میں دیکھا جائے تو تعزیت اور تہنیت کے مختلف انداز اور طریقے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ان تمام انداز اور طریقوں کا احاطہ یا تقابلی مطالعہ مطلوب نہیں ہے بلکہ اسلام میں تعزیت کا جو معنی و مفہوم ہے اور اس سلسلہ میں پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہدایات و تعلیمات ہیں ان کا ذکر مقصود ہے۔

یہ دنیا رنج وراحت کا الگ انداز رکھتی ہے

سب سے پہلے اس حقیقت پر نظر رکھنی چاہیئے کہ اس دنیا میں دکھ اور رنج بھی ہے اور آرام اور خوشی بھی، شادی بھی ہے اور غمی بھی، شیرینی بھی ہے اور تلخی بھی، سردی بھی ہے اور گرمی بھی، خوش گواری بھی ہے اور ناخوش گواری بھی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اور اسی کے حکم اور فیصلہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا حال یہ ہونا چاہیئے کہ جب کوئی دُکھ اور مصیبت پیش آجائے تو وہ مایوسی اور سراسیمگی کا شکار نہ ہوں بلکہ ایمانی صبر و ثبات کے ساتھ اس کا استقبال کریں اور دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، جو ہمارا حکیم اور کریم رب ہے اور وہی ہم کو اس دُکھ اور مصیبت سے نجات دینے والا ہے۔ اسی طرح جب ان کے حالات سازگار ہوں اور ان کی چاہتیں ان کو مل رہی ہوں اور خوشی اور شادمانی کے سامان میسّر ہوں تو بھی وہ اس کو اپنا کمال اور اپنی قوتِ بازو کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اس وقت اپنے دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی بخشش ہے۔ وہ جب چاہے اپنی بخشی ہوئی ہر نعمت چھین سکتا ہے۔ اس لئے ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کریں یہ اسلام کی خاص تعلیمات میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح سے اس کی ترغیب اور تعلیم دی ہے۔ اس تعلیم پر عمل کرنے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ ہر حال میں خدا سے وابستہ رہتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی مصیبتوں اور ناکامیوں سے شکست نہیں کھاتا اور رنج و غم کے تسلسل سے بھی اس کی جان نہیں گھلتی، اور مایوسی اور دل شکستگی اس کی عملی قوتوں کو ختم نہیں کرسکتی۔

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں

جہاں تک تعلق "مصیبتؔ" کا ہے تو ایک حدیث سے واضح ہے کہ جو شئی بھی مسلمان کو ناگوار گذرے بس وہی اس کے حق میں مصیبت ہے، گویا اس کا اطلاق نہایت وسیع اور عام ہے اور اس کے تحت چھوٹا بڑا ہر ناخوشگوار واقعۂ تکوینی آگیا۔ بیماری ہو، مالی نقصان ہو، دوستوں عزیزوں کی جدائی کا صدمہ ہو، موت کا غم ہو، لاولدی ہو، توہین اور بے عزتی ہو، اور اس طرح کی دوسری چیزیں، ایسے تمام مواقع پر مؤمن بندوں کو صبر کرنا چاہیئے جس کا مطلب یہ ہے کہ حالتِ غم اور شدتِ اَلم میں بھی وہ اپنے قدم حدودِ شریعت سے باہر نہیں نکالیں، تاہم صبر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے اور غم کو غم محسوس ہی نہ کرے۔ اس کا نام صبر نہیں، بے حسی ہے، صبر یہ ہے کہ انتہائی غمناک و درد انگیز واقعہ پر بندہ عقل کو نفس پر غالب رکھے، زبان کو شکوہ اور ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دے اور نظر مسبب الاسباب پر، اس کی حکمت و مصلحت پر، اس کی شفقت و حکمت پر رکھے۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

صبر کے سلسلہ میں یہ تو "عقیدۂ قلب" ہوا، جہاں تک معاملہ زبان کا ہے تو چھوٹی بڑی ہر ناگواری کے موقعہ پر جو کلمہ اس سے نکلے وہ ہے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" یعنی بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور

بے شک ہم اسی کی طرف (خواہ آج خواہ چند روز بعد) واپس ہونیوالے ہیں (البقرۃ: ۱۵۶) غور کریں تو اس کلمہ میں تین چیزوں کی تعلیم مل رہی ہے ایک یہ کہ ہم سب عبد محض ہیں اور تمامتر اسی اللہ کی ملک، ہم خود بھی اور ہماری ہر چیز بھی، اپنی کوئی شئی ہی نہیں، نہ بیوی، نہ بچے، نہ مال نہ جائداد، نہ وطن نہ خاندان، نہ جسم نہ جان۔ اکبرالہ آبادی ہی کے بقول

ع جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

غم کو دور کرنے کا نسخہ

انسان کے سارے رنج وغم، درد وحسرت کی بنیاد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوب چیزوں کو اپنی سمجھتا ہے لیکن جب ذہن اس عام مغالطہ سے خالی ہو جائے اور کوئی سی بھی شئی ہو، سرے سے اپنی ہی نہ سمجھے تو گلہ وشکوہ اور رنج وملال کا موقع کہاں باقی رہتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ بڑے بڑے رنج اور صدمے اور دل کے داغ بھی عارضی اور فانی ہیں۔ رہ جانے والے کوئی بھی نہیں ہیں، عنقریب انہیں چھوڑ چھاڑ کر مالک کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہاں پہنچتے ہی سارے قرضے بے باق ہو جائیں گے، ہر کھوئی ہوئی چیز وصول ہو کر رہے گی۔ یہ تینوں عقیدے جس کے جتنے زیادہ مضبوط ہوں گے اسی قدر اس کے دل کو دنیا میں امن وسکون حاصل رہے گا۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ:۔

"غم وحزن کے بار کو ہلکا کرنے کا جو عارفانہ اور تیر بہدف نسخہ قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے یہ صحائف

کائنات میں بے نظیر ہے:۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت تاریخ کا بیان ہے کہ آپؐ ادنیٰ ادنیٰ تکلیف یا ناگواری (کانٹا چبھ گیا، چراغ بجھ گیا، سوئی گم ہوگئی وغیرہ) کے موقع پر بھی یہ کلمہ زبان پر لاتے رہتے تھے اور یہی معمول صحابۂ کرامؓ کا رہا ہے، ان کے نقش قدم پر جو لوگ چلیں گے اور "إنا للہ وانا الیہ راجعون" کی حقیقت کو دل و دماغ میں اتارتے ہوئے زبان سے اس کلمہ کو ادا کریں گے، ایسے ہی لوگوں کے لئے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے کہ "ان پر نوازشیں ہوں گی ان کے پروردگار کی طرف سے اور رحمت بھی، اور یہی لوگ راہ یاب ہیں" (البقرۃ: ۱۵۷)

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" کے سلسلہ میں جو بعض روایات آئی ہیں، ان کا اس موقع پر مطالعہ کرنا، مزید ایمانی تقویت کا باعث ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جب کوئی بندہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنّا الیہ راجِعُوْنَ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو دور فرما دیتا ہے۔ اس کو اچھے انجام سے نوازتا ہے اور اس کو اس کی پسندیدہ چیز اس کے صلہ میں عطا فرماتا ہے۔" ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چراغ بجھ گیا تو آپؐ نے پڑھا "إنا للہ وانا الیہ راجعون" کسی نے کہا یا رسول اللہ! کیا چراغ بجھنا بھی کوئی مصیبت ہے؟ آپؐ نے فرمایا "جی ہاں! جس بات سے بھی مؤمن کو دکھ پہونچے وہ مصیبت ہے (بخاری)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی بندے کا کوئی بچہ مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے کہ کیا تم نے میرے بندے کے بچے کی جان قبض کرلی؟ وہ

کہتے ہیں، ہاں! پھر وہ ان سے پوچھتا ہے، تم نے اس کے جگر کے ٹکڑے کی جان نکال لی؟ وہ کہتے ہیں، ہاں! پھر وہ ان سے پوچھتا ہے، تو میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں، اس مصیبت میں اس نے تیری حمد کی، اور "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا، تو اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ میرے اس بندے کے لئے جنت میں ایک گھر تعمیر کرو اور اس کا نام "بیت الحمد" (شکر کا گھر) رکھو۔" (ترمذی)

ایک حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان مرد یا عورت پر کوئی مصیبت آئی اسے یاد کر کے بعد میں اس نے "اِنا للہ وانا الیہ رَاجعون" کہا، اگرچہ مصیبت پر زمانہ گذر گیا ہو مگر اللہ تعالیٰ اس پر نیا ثواب عطا فرماتا ہے اور ویسا ہی ثواب دیتا ہے جیسا اس دن کہ جس دن نئی مصیبت آئی تھی، اور اس نے اس وقت "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہا تھا۔ (احمد و بیہقی)

...ت کا انداز

ایک انسان خود کسی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو یا کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کا واقعہ اس کے سامنے آیا ہو یا کسی کا انتقال ہو گیا ہو، ہر صورت میں "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہنا چاہیئے، مصیبت زدہ لوگوں کی تعزیت کرنا، خواہ اس کے پاس جا کر یا وہ آیا ہو تو ملاقات کے دوران یا کسی کے ذریعہ پیغام بھیج کر، یا خط لکھ کر، یہ تمام صورتیں نبی اکرم، ہادیٔ اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں جس کا اندازہ آپ کو درج ذیل حدیثوں سے ہوگا:

"حضرت قرّۃ بن ایاس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم جب نشست فرماتے تو آپؐ کے صحابہؓ میں سے کچھ
لوگ آپؐ کے پاس بیٹھ جاتے، ان بیٹھنے والوں میں ایک صاحب
تھے جن کا ایک چھوٹا بچہ تھا، یہ بچہ حضورؐ کے پاس آپؐ کی پشت کی
جانب سے آتا تو آپؐ اس کو اپنے سامنے بٹھا لیتے، پھر ایسا ہوا کہ
وہ بچہ مرگیا، تو بچہ کے والد اس کے غم میں کچھ دنوں آپؐ کی مجلس میں
نہیں آئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ وہ شخص کیوں نہیں آتا؟
کیا بات ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ان کا چھوٹا بچہ جسے آپ نے دیکھا تھا
انتقال ہوگیا (شاید اسی وجہ سے وہ نہیں آرہے ہیں) یہ خبر پاکر آپؐ
ان سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے اور بچہ کے بارے میں دریافت
فرمایا۔ جب انہوں نے بتایا کہ اس بچہ کا انتقال ہوگیا ہے تو آپؐ نے
انہیں تسلی دی پھر فرمایا، بتاؤ تمہیں کیا چیز پسند ہے؟ کیا یہ بات پسند
ہے کہ وہ بچہ زندہ رہے، یا یہ پسند ہے کہ وہ بچہ پہلے جائے اور جنت
کا دروازہ تمہارے لئے کھولے اور جب تم پہنچو تو وہ تمہارا استقبال
کرے۔" (نسائی شریف)

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ" نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب
غزوۂ احد سے واپس تشریف لائے تو خواتین اپنے اپنے عزیزوں
اور رشتہ داروں کا حال معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئیں۔ جب حضرت
حمنہ بنت جحشؓ آپؐ کے سامنے آئیں تو آپؐ نے انہیں صبر کی تلقین
فرمائی اور کہا اپنے بھائی عبداللہؓ پر صبر کرو، انہوں نے اِنا للہ وانا
الیہ راجعون پڑھا اور دعائے مغفرت کی۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اپنے
حمزہؓ پر بھی صبر کرو، انہوں نے پھر اِنا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور

دعائے مغفرت کی :

"حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہلا بھیجا کہ میرے بچے کا آخری دم ہے اور چل چلاؤ کا وقت ہے، لہٰذا آپؐ اس وقت تشریف لے آئیں آپؐ نے اس کے جواب میں سلام کہلا بھیجا اور پیام دیا کہ بیٹی! اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اسی کا ہے اور کسی کو جو کچھ دے وہ بھی اسی کا ہے۔ الغرض ہر چیز ہر حال میں اسی کی ہے (اگر کسی کو دیتا ہے تو اپنی چیز دیتا ہے اور کسی سے لیتا ہے تو اپنی چیز لیتا ہے) اور ہر چیز کے لئے اس کی طرف سے ایک مدّت اور وقت مقرر ہے (اور اس وقت کے آجانے پر وہ چیز اس دنیا سے اٹھالی جاتی ہے) پس چاہئے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس صدمہ کے اجر و ثواب کی طالب ہو، صاحبزادی صاحبہ نے پھر آپؐ کے پاس پیام بھیجا اور قسم دی کہ اس وقت حضور ضرور ہی تشریف لے آئیں۔ اس کے بعد آپؐ جانے کیلئے اٹھے، آپؐ کے اصحاب میں سے سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، اُبی بن کعب، زید بن ثابت اور چند اور لوگ آپؐ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بچہ (یعنی آپؐ کا نواسہ) اٹھا کر آپؐ کی گود میں دیا گیا۔ اس وقت اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس کے اس حال کو دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس پر سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا، حضرت یہ کیا؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ رحمت کے اس جذبے کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان ہی بندوں

پر ہو گی جن کے دلوں میں رحمت کا یہ جذبہ ہو (اور جن کے دل سخت اور رحمت کے جذبے سے بالکل خالی ہوں۔ وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہ ہوں گے) (مسلم)

اسی طرح کا واقعہ خود آپؐ کی ذات سے متعلق ہے۔ آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم آپؐ کی گود میں تھے۔ یہ وقت ان کی جاں کنی کا تھا۔ یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور فرمایا "اے ابراہیم! ہم تیری جُدائی سے مغموم ہیں مگر زبان سے وہی نکلے گا جو پروردگار کی مرضی کے مطابق ہو گا" (مسلم)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کا ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ تعزیت نامہ لکھوایا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم —— اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام، میں پہلے اس اللہ کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، (بعد ازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ کا اجرِ عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں، ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال، یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی اللہ تعالیٰ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی، اپنی اس امانت کو تم سے واپس

لے لیا اور وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص نوازش اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت کی تم کو بشارت ہے، اگر تم نے ثواب اور رضاء الٰہی کی نیت سے صبر کیا ــــ پس اے معاذ! صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع و فزع (آہ و بکا، چیخ و پکار) تمہارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محرومی رہی) اور یقین رکھو کہ جزع و فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے دل کا رنج و غم دور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے بلکہ یقیناً ہو چکا ہے۔"
(المعجم الکبیر للطبرانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس "تعزیت نامہ" میں ہر اس صاحبِ ایمان بندے کے لئے تعزیت و نصیحت اور تسلی و تشفی کا پورا سامان ہے جس کو کوئی صدمہ پہنچے، کاش اپنی مصیبتوں میں ہم رسول اللہ ؐ کی اس ایمان افروز تعزیت و نصیحت سے سکون حاصل کریں اور صبر و شکر کو اپنا شعار بنائیں۔

تعزیت کے سلسلہ میں اوپر جو حدیثیں اور روایات درج کی گئی ہیں، ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علماء نے تعزیت کو "سنت" قرار دیا ہے صراحتاً حدیث بھی ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کی کسی مصیبت میں تعزیت کریگا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن بزرگی کے لباس پہنائے گا (ابن ماجہ) ایک اور حدیث میں ہے کہ جو کسی مصیبت والے کی تعزیت کرے گا اُسے اس کے برابر ثواب ملے گا۔ (ترمذی) تعزیت کا جو انداز ہونا چاہیئے اس کا ایک بہترین خاکہ اس تعزیت نامہ میں ہے، جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے لئے لکھوایا تھا۔ اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں "فَاَعْظَمَ اللّٰہُ لَکَ الْاَجْرَ وَاَلْھَمَکَ الصَّبْرَ وَرَزَقْنَا وَاِیَّاکَ الشُّکْرَ" (اللہ تعالیٰ تمہیں اجرِ عظیم دے اور تمہیں صبر دے اور ہمیں اور تمہیں شکر کی توفیق بخشے)۔ ——— آپؐ اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو ان کے فرزند کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی الفاظ ارشاد فرمائے تھے ان میں بھی ہمارے لئے نمونہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا" اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی، وَکُلٌّ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ" (جو لے لیا وہ اللہ ہی کا تھا، جو دیا وہ اسی کا تھا اور اللہ کے یہاں ہر ایک چیز ایک معین حد (مدت) تک ہے، پس صبر کرو اور ثواب کی امید رکھو)

جو شخص تعزیت کر رہا ہو اس کے لئے یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

"اَعْظَمَ اللّٰہُ اَجْرَکَ وَاَحْسَنَ عَزَاکَ وَغَفَرَ لِمَیِّتِکَ" (اللہ تعالیٰ تم کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، تیرے صبر کا اچھا بدلہ دے اور تیرے مُردے کو بخش دے) اگر میت غیر مکلف ہو یعنی بچہ یا مجنون ہو تو غَفَرَ لِمَیِّتِکَ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

غیر مسلم کی تیمار داری و تعزیت

یہاں ایک پہلو اور قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ اسلام میں اعلیٰ انسانی اخلاق و اقدار کا جو تصور ہے اس کے پیشِ نظر یہ کیسے ممکن تھا کہ غیر مسلم کی بیماری میں اس کی طرف سے تیمار داری اور مزاج پُرسی نہ ہو، ایک حدیث قدسی میں تو مطلق انسان کی بعض اہم ضرورتوں (کھانا، پینا، عیادت اور تیمار داری وغیرہ) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ضرورتیں قرار دیتے ہوئے

ان کی تکمیل کے لئے آنے والوں کو اپنی رضا اور قرب کا پروانہ عطا فرمایا ہے اور ایسے مواقع پر نہیں آنے والوں کی قیامت میں مؤاخذہ اور بازپرس کی خبر سنائی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر مسلم بیمار کی عیادت ثابت ہے۔ اسی طرح جب انتقال ہو جائے تو انتقال ہونے والے کے غیر مسلم رشتہ داروں کی تعزیت کرنی چاہئے، جس میں مناسب حال تسلی و تشفی کے کلمات ہوں ـــــــ اس سلسلہ میں فقہی کتابوں میں جو الفاظ ملتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

" اَعْظَمَ اللّٰہُ اَجْرَكَ وَاَحْسَنَ عَزَاكَ " (الموسوعۃ الفقہیہ ج ۱۲ ص ۲۸۹)

اسی طرح یہ جملہ بھی ہے" اَخْلَفَ اللّٰہُ عَلَیْكَ خَیْرًا وَاَصْلَحَكَ" (فتاوی محمودیہ ج ۹، ص ۱۶۱) ان دونوں جملوں کا مفہوم یہ ہے کہ اس مصیبت پر اللہ تعالیٰ بڑا اور اچھا بدلہ دے، بعد میں اچھی صورت نکالے اور حال درست فرما دے۔

تعزیت کے احکام

بہتر یہ ہے کہ میت کے تمام قریبی رشتہ داروں سے تعزیت کی جائے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، مرد ہوں یا عورت، مگر عورت کے سلسلہ میں یہ قید ہے کہ وہ محرم ہو، غیر محرم نہ ہو۔ تعزیت کا وقت موت سے لے کر تین دن تک ہے، اس کے بعد پسندیدہ نہیں ہے کہ غم تازہ ہوگا لیکن اگر تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جائے، وہاں موجود نہیں ہے یا اسے علم نہیں ہے تو بعد میں حرج نہیں، جو ایک بار تعزیت کر آیا اسے دوبارہ تعزیت کے لئے جانا پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ بھی علم میں رہے کہ تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں ہے، مگر وہ عورت جس

کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اس کے لئے چار ماہ دس دن سوگ کرنے کی اجازت ہے۔ سوگ کے اس زمانہ کی جو تفصیلات اور حکمتیں ہیں وہ اہل علم سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح مُردوں کی اچھائی کا تو تذکرہ کرنا چاہئے مگر بُرائی کے بیان سے اپنی زبان کو روک لینی چاہئے۔

یہ بھی واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام جاہلیت میں رواج یافتہ ماتمی رسوم کو یکسر ختم کر دیا اور انسان کے فطری غم کے اظہار کے لئے تہذیب و شرافت کے دائرہ میں رہتے ہوئے تعزیت کی جو بہتر صورتیں ہو سکتی تھیں، ان کی اجازت دی ہے، جس کا حاصل ہے میت کے لئے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب اور اہلِ میت کے لئے تسلی و تشفی کے کلمات اور صبر کی تلقین۔ ان سے ہٹ کر دوسری قوموں اور تہذیبوں سے خوشہ چینی کرنا اور نئے نئے طریقے وضع کرنا افسوسناک بھی ہے اور اسلامی غیرت اور دینی حمیت کے خلاف بھی۔ رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی دوسری قوم کے اخلاق و عادات اور اطوار و کردار کی پیروی کرنے لگے وہ انہیں میں سے ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنے ہر عمل کو سنت اور شریعت کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اسلام ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب ہے۔ کسی دوسرے مذہب اور تہذیب و تمدن سے کوئی چیز لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی لئے سورۃ بقرہ آیت (۲۰۸) میں اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔ یعنی اسلامی عقائد و اعمال اور احکام و تعلیمات کی صداقت و حقانیت پر دل و دماغ بھی مطمئن

ہو اور اعضاء و جوارح بھی عملی ثبوت پیش کر رہے ہوں ۔

سوگ میں خاموشی کا مسئلہ

جہاں تک تعلق سوگ میں خاموشی کا ہے تو یہ مغربی تہذیب کا اپنا انداز ہے ، اسلامی شریعت سے اس کا تعلق نہیں ہے" فتاویٰ رحیمیہ" مشہور فقہ و فتاویٰ کی کتاب ہے ۔ اس کے مؤلف معروف و ممتاز عالم دین مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ ہیں ۔ ان سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ " مسلمانوں میں کسی لیڈر یا بڑے آدمی کی وفات پر انگریزوں کی طرح دو منٹ گردن جھکا کر ساکت کھڑے رہ کر سوگ (تعزیت) منانے کا طریقہ رواج پا رہا ہے ، کیا یہ جائز ہے ؟ حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب دیا کہ سوگ منانے کا مذکورہ طریقہ جائز نہیں ہے ۔ اس میں دوسری قوم کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے ۔ لہٰذا اس رواج کو ترک کر دینا ضروری ہے ۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج ۱، ص ۳۸۵) اس فتویٰ کو نقل کرنے سے اسلامی نقطۂ نظر کی تحقیق ، اس سے روشناس کرانا اور اس کو اختیار کرنے کی دعوت ہے نہ کہ کسی کے عمل ، طریقہ اور رواج کی تحقیر و تضحیک ——— قرآن کا فرمان ہے" کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ " (الروم - ۳۲) یعنی ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ " یہ حقیقت تو بالکل کھلی ہوئی ہے کہ ہر گروہ اور ہر ٹولی عام اس سے کہ وہ اہلِ حق میں سے ہو یا اہلِ باطل سے بس اپنے ہی مزعومات و معتقدات ، یا آج کل کی زبان میں اپنی آئیڈیالوجی ہی

یں مست ہے ۔ اس لئے اگر کسی تہذیب اور معاشرت میں اجتماعی تعزیت کے موقع پر کچھ دیر کی "خاموشی" کا عنوان اختیار کیا گیا ہو تو یہ اس کا "اندرونِ خانہ" معاملہ ہے۔ اہلِ اسلام کا طریقہ وہی ہونا چاہیئے جس کی وضاحت اُوپر کی سطروں میں کی گئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کا حلقہ ہو تو تعزیت کا اسلامی طریقہ ہی اپنانا چاہیئے۔ اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا اسلامی شان کے خلاف ہے، دیکھنے میں بعض چیزیں چھوٹی معلوم ہوتی ہیں مگر چھوٹی چیزوں کا اہتمام کرنے والا ہی بڑی چیزوں کی رعایت اپنی زندگی میں کر سکتا ہے۔ ایک عاشق اور محب کو تو "مزاجِ یار" کا آشنا اور رمز شناس ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی مسلمان خاموشی والی نوعیت میں کہیں گرفتار یا مبتلا ہو گیا ہو تو موقع اور حالات کے لحاظ سے اپنے لئے کوئی پہلو یا حکمتِ عملی اختیار کر لے ———— علامہ اقبالؒ کی یہ بات کس قدر دور رس اور گہری حقیقت کی حامل ہے ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿

شرعی شادی

"رہے رسولؐ کے قدموں پہ سر خدا کے لئے"

لیجئے! دیکھتے دیکھتے ماشاءاللہ لڑکا جوان ہو گیا، لڑکی سنِ بلوغ کو پہنچ گئی، زندگی کے اس مرحلے پر اب "شادی" ناگزیر ہے، فطرت کا یہی اشارہ ہے، انبیاءؑ کی یہی سنت ہے، نظروں کی حفاظت اسی میں ہے، لڑکے کو عفت کا تاج اسی سے حاصل ہوتا ہے، لڑکی کو عصمت کا زیور اسی ذریعہ سے ملتا ہے، یہ قلب و نظر کی پاکیزگی کا اہتمام ہے، نسلِ انسانی کی بقاء اور افزائش کا سامان ہے، جنسی تسکین اور باہمی سکون و راحت کے حصول کا فطری اور شرعی عنوان ہے، ایسا عنوان جس کے بارے میں علماء کا اعلان ہے:

لیس لنا عبادۃ شرعت من عھد آدم الی الان ثم تستمر فی الجنۃ الا النکاح والایمان۔ (درمختار، کتاب النکاح)	جو عبادتیں ہمارے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں، ان میں کوئی ایسی عبادت نکاح اور ایمان کے علاوہ نہیں ہے جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہو اور پھر جنت تک ساتھ چلی جائے۔

یہ اعلان کس قدر مہتم بالشان ہے، کون انسان ہو گا، جس کے دل میں اس "عبادت" کا ارمان نہ ہو، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ نکاح میں جلدی کرو۔ بالغ ہو جانے کے بعد اس میں تاخیر بہت سارے فتنہ و فساد کو دعوت دیتی ہے، اس سلسلہ میں قرآن کے ایک اہم بیان کا حاصل یہ ہے کہ لڑکی والوں کے پاس اگر کسی نیک اور شریف آدمی کا پیغام آئے تو محض اس کی غربت کو دیکھ کر انکار نہ کریں، مال

آنے جانے والی چیز ہے۔ اصل چیز "صلاحیت عمل" ہے۔ اگر یہ لڑکے میں موجود ہے، تو نکاح سے انکار ٹھیک نہیں۔ اسی بیان میں لڑکے والوں کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ کسی نوجوان کو محض اس لئے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کما رہا ہے۔ اور نوجوانوں کو بھی نصیحت کی گئی ہے کہ زیادہ کشائش کے انتظار میں شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں، تھوڑی آمدنی بھی ہو تو اللہ کے بھروسے پر شادی کر لینی چاہیئے۔ اکثر حالات میں شادی آدمی کے حالات درست کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

لڑکا ہو یا لڑکی، انتخاب میں بہر حال "دینداری" کو ترجیح دینی چاہیئے۔ انتخاب کی منزل میں لڑکا اگر لڑکی کو "حسن تدبیر" اور "حکمت عملی" سے دیکھ لے تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے، تاہم یہ کام کسی سمجھ دار اور قابلِ اعتبار رشتہ دار خاتون سے لیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ لڑکی نے بھی شوہر کے انتخاب میں اپنے سرپرستوں پر اعتماد کیا اور بطور خود کوئی پیش قدمی نہیں کی، کہ یہ کسی اچھے باحیا اور شریفانہ ماحول کے خلاف ہے۔ لڑکے یا اس کے گھر والے نے گھوڑے جوڑے (یا کیش یا تلک) کا مطالبہ حرام سمجھ کر نہیں کیا، نہ ہی جہیز کی مانگ کی گئی اور نہ ہی اس سلسلہ میں لڑکی والے نے رسم و رواج کی زنجیر میں اپنے آپ کو باندھا۔ مہر کی رقم بوقتِ نکاح ادا کرنے کو اچھا سمجھا گیا اور اس کے مقرر کرنے میں اعتدال، توازن اور مزاج شریعت کو ملحوظ رکھا گیا۔

اچھا! بات پختہ ہو گئی، تاریخ مقرر ہو گئی، ہر دو طرف گھر کو تھوڑا سنوار لیا گیا، سیدھے سادے طریقے پر اعزہ و احباب کو مطلع کر دیا گیا، کسی وجہ سے کسی قریبی آدمی کو اطلاع نہیں دی جا سکی تو شکایت کا دفتر نہیں کھولا گیا، دن مقرر ہوا جمعہ کا، وقت عصر کے بعد کا (بشرط سہولت مہینہ میں شوال کی رعایت رکھی گئی) مقام منتخب کیا گیا مسجد کا، حضورؐ کی یہی ہدایت ہے۔ چونکہ نکاح ایک عبادت ہے اور عبادت کے لئے موزوں ترین جگہ مسجد ہی ہے۔ پھر نکاح کا زیادہ سے زیادہ اعلان ہو، یہ مقصود بھی یہاں حاصل ہے

جگہ کی برکت اور تقدس سے گانے باجے اور کیمروں کی تاک جھانک (تصویر کشی) اور دیگر خرافات اور "شادی خانہ" کے بھاری بھرکم اخراجات سے از خود نجات مل گئی، خطبۂ مسنونہ پڑھا گیا، ایجاب وقبول ہوا۔ گویا طرفین نے ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے خلوص و محبت کے ساتھ رہنے کا عہد و پیماں باندھا۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ہ (وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو) کی قرآنی تعبیر کو برتنے کا موقع آیا، دولہا دلہن کو خیر و برکت کے لئے یہ نورانی نبوی دعا وردِ زبان لائی گئی: جَمَعَ اللّٰهُ شَمْلَكُمَا وَاَسْعَدَ جَدَّكُمَا وَبَارَكَ عَلَيْكُمَا وَاَخْرَجَ مِنْكُمَا كَثِيْرًا طَيِّبًا۔ چھوارے لٹائے یا تقسیم کئے گئے۔ بعض ضرر اور آدابِ مسجد کی رعایت میں آج کل تقسیم ہی بہتر ہے۔

اس نورانی مجلس کے اختتام کے موقع پر حاضرین، دوست احباب ان نورانی الفاظ کے ذریعہ دولہا دلہن اور ان کے اولیاء کو مبارکباد دینے لگے: بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَبَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِيْ خَيْرٍ۔

دلہن کو آراستہ کر کے بلا تکلف و اہتمام اور بلا رسم جلوہ اور دھوم دھام نوشہ کے گھر رخصت کر دیا گیا۔ شبِ زفاف آئی، نوشہ نے سنتِ نبویؐ کے مطابق دلہن کے موئے پیشانی پکڑے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ یہ دعا پڑھی: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِهَا وَخَيْرِ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ ـــــــ پھر صحبت سے پہلے دونوں نے یہ دعا پڑھی: بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا ـــــــ دوسرے یا تیسرے روز سنتِ نبویؐ اور شکر نعمتِ الٰہی میں "دعوتِ ولیمہ" کی گئی جس میں اعزہ اور دوست احباب کے ساتھ غرباء و مساکین کو بطورِ خاص بلایا گیا۔ کیونکہ حضورؐ کی نظر میں وہ ولیمہ بہت برا ہے جس میں امراء اور صاحبِ حیثیت بلائے جائیں اور غرباء و مساکین چھوڑ دئے جائیں۔ دعوتِ ولیمہ

میں تکلف و تفاخر اور نام و نمود کے اظہار سے اجتناب کیا گیا، قرض سے اپنے آپ کو بچایا گیا، سادگی، آسانی اور اختصار کو پیش نظر رکھا گیا۔

یہ ہے شرعی شادی کا اجمالی خاکہ اور مختصر بیان جس میں پاؤں میز کی رسم سے جھگیوں تک کی رسم اور دیگر تکلیف دہ خلاف رواج کا کوئی تصور نہیں اس "ایجاد بندہ" سے خدا کی سیدھی سادی اور نورانی شریعت بیزار ہے۔ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ اصولی فرمان ہے کہ: اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ۔ (اتنا ہی زیادہ نکاح با برکت ہے جس میں تکلیف و پریشانی جتنی ہی کم ہو اور جتنا ہی کم خرچ ہو اور اسراف و فضول خرچی اور نام و نمود سے بچا جائے)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کی یہ بات دین و دانش اور عقل و تجربہ سے کس قدر قریب ہے۔

"ہر چیز میں کچھ نہ کچھ خرچ کی ضرورت ہے، بجز نکاح کے، کہ یہ اپنی حقیقت میں ایک پیسہ پر بھی موقوف نہیں، کیونکہ اس کی حقیقت ایجاب ہے اور قبول اور یہ محض دو بول ہیں زبان کے، ان میں کسی خرچ کی کیا ضرورت ہے، چھوارے سو وہ محض مستحب ہیں، مہر میں مؤجل (ادھار) کی بھی گنجائش ہے، تو فرمائیے سب سے زیادہ سستی چیز اگر کوئی تھی تو نکاح تھا، مگر اللہ بھلا کرے ہمارے بھائیوں کا، سب نے آپس میں کمیٹی کر کے اس کو ایسا مہنگا کر دیا اور رسم و رواج کی زنجیروں سے ایسا جکڑ دیا کہ غریب آدمی کی تو مصیبت ہے، امیروں کے لئے بھی زحمت ہے اور اس میں مزاحمت ہے عقل کی بھی اور مزاحمت ہے شریعت کی بھی، بھلا یہ کون سی عقل کہہ سکتی ہے کہ جس چیز میں مطلق روپے کی ضرورت نہ ہو اس میں فضول اس قدر روپے صرف کر ڈالو اور رسم و رواج کا

طومار باندھ لو"۔ (میلاد النبی، صفحہ ۷۷)

مسلم معاشرہ شادی بیاہ میں خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کے بجائے رسم و رواج کا پابند ہو گیا ہے، اس سے متأثر ہو کر بھوپال کے صاحبِ دل بزرگ مولانا محمد یعقوب مجددیؒ نے ایک بات بڑے درد و سوز سے کہی ہے، جو ایک مسلم کے قلب و ضمیر کو جھنجھوڑنے اور اپنا محاسبہ کرنے کے لئے بہت کافی ہے، فرماتے ہیں:

"شادیوں میں سب بلائے جاتے ہیں، صرف خدا اور رسولؐ کو رخصت کر دیا جاتا ہے، صرف شادی کے اوقات میں وہ باہر رہتے ہیں، پھر ان سے راہ و رسم پیدا کر لی جاتی ہے۔ (صحبتے با اہلِ دل صفحہ ۲۴۴)

شادی بیاہ سے متعلق مسلم معاشرہ میں جو بے راہ رویاں، پیچیدگیاں اور نت نئی پریشانیاں پائی جا رہی ہیں، جن کے اثرات بعد کی ازدواجی زندگی پر بھی مرتب ہو رہے ہیں، ان سب کا علاج یہ ہے کہ مسلم معاشرہ ہر طرح کے رسم و رواج کے خول سے نکل کر سنت و شریعت کی روشن شاہراہ پر آ جائے۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے: "رسولؐ جو دیں انہیں لے لو اور جن چیزوں سے روکیں، ان سے رک جاؤ"۔ قرآن کا یہ بھی فرمان ہے کہ "رسولؐ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے"۔

حکیم شاعر اکبر الہ آبادی کا یہ پیغام بھی خوب ہے ؎

قدم بڑھاؤ ترقی کرو ضرور و لے
رہے رسولؐ کے قدموں پہ سر خدا کے لئے

مسلم معاشرہ اور مسئلہ طلاق

موجودہ مسلم معاشرہ پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو بہت ساری بے اعتدالیاں، ناہمواریاں اور فکر و عمل کی کوتاہیاں سامنے آتی ہیں اور خیال آتا ہے کہ ایک صاحبِ کتاب اور صاحبِ قوم کے افرادِ شریعت اپنی کتاب اور اپنی شریعت سے کس قدر دور جا پڑے ہیں، رسم و رواج کی بوجھل زنجیر ان کے قدموں میں ڈھلی ہوئی ہے اور ہوا و ہوس نے انہیں اپنے مضبوط گھیرے میں لے رکھا ہے۔ شریعت اور سنّت انسان کی سہولت کے لئے ہے۔ اس پر چلنے سے ذہنی سکون، قلبی اطمینان اور سماجی وقار و اعتماد حاصل ہوتا ہے، لیکن لوگوں نے شریعت اور سنت پر اپنے مزاج اور طبیعت کو غالب کر رکھا ہے، جس کا نتیجہ وہ انتشار و بحران ہے جس کا نظارہ ہم اپنے معاشرہ میں ہر طرف دیکھتے ہیں۔

مسلم معاشرہ میں جو مسائل انتشار و بحران کا سبب بنے ہوئے ہیں ان میں ایک اہم مسئلہ "طلاق" کا بھی ہے، یہ مسئلہ حد درجہ قابلِ توجہ اور اصلاح طلب ہے۔ عام طور پر لوگ اس کی نوعیت، استعمال کی صورت اور سلسلہ میں جو شرعی نزاکت اور دینی حکمت و مصلحت ہے، اس سے ناواقف اور بے خبر ہیں۔ اس ناواقفیت اور بے خبری نے مسلمانوں کے لئے بعض

سنگین سماجی مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی عائلی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے۔ دل کا کیف اور دماغ کا سرور چھن گیا ہے۔ طلاق کے سبب عام حالات میں مرد اور عورت کے درمیان نفرت و کدورت کی دیوار تو حائل ہو ہی جاتی ہے، ان دونوں سے وابستہ دو خاندان کے درمیان بھی رسّہ کشی کی نوبت آجاتی ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کے ذہنی نشوونما اور طبائع و نفسیات پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ اگر بات مقدمہ بازی تک پہنچتی ہے تو دولت، وقت اور توانائی، یہ سب بے دریغ ضائع ہوتے ہیں، ذہنی الجھن، دماغی پریشانی، نفسیاتی کشمکش اور اعصابی تناؤ کا دباؤ بسا اوقات اتنا بڑھ جاتا ہے کہ آدمی بے خوابی کا شکار ہو جاتا ہے اور بتدریج سنجیدہ اور ذمہ داری کے کام کو انجام دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، عمومی تعلقات اور عام میل جول میں بدمزگی اور بے کیفی محسوس کرنے لگتا ہے۔ مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ بات بات میں غصہ اور طیش آجاتا ہے، جسمانی صحت بھی تیزی کے ساتھ رو بہ زوال ہونے لگتی ہے۔ معاشی نظام بھی ابتر ہو جاتا ہے۔ معمولاتِ زندگی میں بھی بڑا فرق آجاتا ہے۔ گویا اس "ایک" (طلاق) کا اثر "اکیس" چیزوں پر پڑتا ہے، مگر اس حقیقت کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہیں بارگاہِ خداوندی سے آنکھ کے نور کے ساتھ دل کا نور بھی ملا ہوا ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب ۔۔۔ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

طلاق خاندانی زندگی کو تہس نہس کرنے میں کتنا اثر رکھتا ہے اور اس کے کس قدر دور رس اثرات، انفرادی اور اجتماعی زندگی پر مرتب ہوتے

ہیں، اس کا اندازہ صحیح مسلم کی اس حدیث سے کیا جا سکتا ہے، جس میں ذکر ہے کہ شیطان (جو انسان کا ازلی اور سند یافتہ دشمن ہے) کو سب سے زیادہ خوشی میاں بیوی کے درمیان جدائی سے ہوتی ہے، اپنے جس کارندے سے وہ کام لیتا ہے، اس کی رپورٹ کے بعد مسرت سے سرشار ہو کر گلے لگاتا ہے اور اپنے تخت پر قریب بیٹھاتا ہے، گویا شیطان کی جانب سے یہ "اعترافِ حسنِ خدمت" ہے، اور اس کی جانب سے عطا کردہ "اعزاز" کا یہ خاص "انداز" ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ ایک ترتیب کے ساتھ مسئلۂ طلاق کی نوعیت اور حقیقت کو اُجاگر کیا جائے اور اس سلسلہ میں جو شرعی نقطۂ نظر ہے اس کو صحیح خط و خال کے ساتھ سامنے لایا جائے اس موضوع سے متعلق جزئیات اور تفصیلات بہت زیادہ ہیں، ظاہر ہے کسی اخبار یا رسالہ کے محدود صفحات اور مختص کالم میں شرح و بسط کے ساتھ ان جزئیات و تفصیلات کو بیان کرنے کی گنجائش کہاں؟ اس لئے اختصار کے ساتھ ہی چند نکات میں مفہوم و مدعا بیان کرنے کی سعی رہے گی۔

۱۔ چند اخلاقی اور سماجی فوائد کے حصول کے لئے نکاح کے ذریعہ مرد اور عورت کے درمیان جو رشتہ وجود میں آتا ہے، وہ نہایت مقدس اور پاکیزہ ہے۔ اسلامی شریعت چاہتی ہے کہ یہ رشتہ مضبوط اور مستحکم رہے۔ اور ان دونوں کے درمیان ہمیشہ محبت و الفت کی فضاء قائم رہے۔ اس لئے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے سے پہلے مختلف باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے باوقار طریقہ پر چھان بین کرلی جائے اور

خوب اچھی طرح اس کا اندازہ قائم کرلیا جائے کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ نباہ ہو سکے گا یا نہیں؟ اس فیصلہ کے بعد ہی نکاح کا اقدام کرنا چاہیئے۔

نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد میاں بیوی کو چاہیئے کہ ایک دوسرے کے جذبات اور نفسیات کا خاص خیال رکھیں۔ زندگی کی گاڑی کو باہمی اعتماد کے ساتھ کھینچیں، رشتہ کی اس دیوار میں کہیں سے کوئی شگاف نہ آنے دیں، ناگواری کی کوئی شکل سامنے آجائے تو اسے خوشگواری میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں، دل کو بڑا کرکے عفو و درگذر سے کام لیں۔ اس موقع پر ایک دوسرے کے عیوب اور کمزوریوں پر نظر رکھنے کی بجائے محاسن اور خوبیوں پر نگاہ ڈالیں، اور یہ سوچیں کہ ایجاب وقبول کے ذریعہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بھر ساتھ رہنے کا عہد و پیمان کیا ہے۔ اس کا توڑنا ہمارے اور ہمارے خاندان کے لئے رسوائی اور انگشت نمائی کا باعث ہوگا اور مختلف قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں سر اٹھائیں گی، سچ ہے رشتہ توڑنا تو آسان ہے مگر اس کو باقی اور برقرار رکھنا بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔ اس میں انسان کے کمال اور اس کی شرافت کا راز پوشیدہ ہے۔ اس کے لئے "اکڑ" کی بجائے "جھکنے" کی خو چاہیئے، بلاشبہ جس کے اندر یہ "خو" ہے، وہ ایک بڑی کرامت کا حامل ہے، یہ کرامت دو دلوں کے درمیان فاصلے نہیں آنے دیتی، بلکہ ان کو آباد رکھتی ہے اور اجڑنے سے بچاتی ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

۵ دل کا اجڑنا سہل سہی ہے، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے، بستے بستے بستی ہے

اوپر کی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا، اس کی تائید و توثیق قرآن و حدیث سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ سورۂ بقرہ (آیت ۱۸۷) میں ہے " وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو " (قرب و اتصال کے لحاظ سے یا ایک دوسرے کے پردہ دار اور موجب تسکین ہونے کے لحاظ سے) اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے " اور عورتوں کا (بھی) حق ہے، جیسا کہ عورتوں پر حق ہے، موافق دستور (شرعی) کے " (آیت ۲۲۸)

یہ قرآنی بلاغت کا ایجاز ہے کہ اتنا بڑا مضمون اتنے مختصر فقرے میں آگیا۔ غور کیا جائے تو میاں بیوی کے باہمی حقوق کا پورا دفتر اس میں سمٹ کر آگیا ہے۔ تحقیقی مطالعہ بتاتا ہے کہ حقوقِ زوجین کے سلسلہ میں ایسی جامع اور بلیغ تعلیم اسلام کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی، یہ تو اسلام کے نام لیواؤں کا کام ہے کہ اس کی حقیقت، معنویت اور اہمیت کو سمجھیں، اور " حقوق و فرائض " کی ادائیگی کا جو پیغام مل رہا ہے، اس پر بھرپور توجہ دیں۔ اس سے ازدواجی زندگی بنی اور سنوری رہے گی اور جدائی کی نوبت نہیں آئے گی۔

قرآنِ حکیم میں ایک جگہ نیک بیویوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ شوہروں کی فرماں بردار ہوتی ہیں، جب پانچوں وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی شرم و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کی فرمانبردار رہے تو پھر (اسے حق ہے کہ) جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہو " (حلیہ ابونعیم) اس کے

بالمقابل آپؐ نے فرمایا ہے کہ "لوگو! بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کے بارے میں میری وصیت مانو" (بخاری) یعنی میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کی ان بندیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، نرمی اور مدارات کا برتاؤ رکھو" ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مسلمانوں میں اس آدمی کا ایمان زیادہ کامل ہے جس کا اخلاقی برتاؤ (سب کے ساتھ) بہت اچھا ہو (اور خاص کر) بیوی کے ساتھ جس کا رویہ لطف و محبت کا ہو" (ترمذی)

۲۔ اگر شوہر کو اپنی بیوی کی عادات واطوار میں کوئی بات مرضی کے خلاف اور ناپسندیدہ معلوم ہو اور اچھی نہ لگے تو اس کی وجہ سے اس سے نفرت اور بے تعلقی کا رویہ اختیار نہ کرے اور نہ طلاق کے بارے میں سوچے بلکہ اس میں جو خوبیاں ہوں، ان پر نگاہ کرے اور ان کی قدر و قیمت سمجھے، یہ مؤمن شوہر کی صفتِ ایمان کا تقاضا اور مؤمنہ بیوی کے ایمان کا حق ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے" اور بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گذر بسر کیا کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب کیا کہ تم ایک شئی کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھدے (النساء ۱۹)

تفسیر ماجدی میں ہے" شکایت کرنے والے شوہروں کو اپنی تسکین و تسلی کے لئے اس مراقبہ سے بڑھ کر کون خیال ہوسکتا ہے کہ بیوی کے ساتھ نباہ کرتے رہنے میں اللہ کے علم میں "خیر" ہے۔ اس "خیر" (بھلائی) کے اندر دنیوی و اخروی، عاجل (جلد حاصل ہونے والی) و آجل (دیر میں ملنے والی) ہر قسم کی فلاح اور بھلائی آگئی، محض خیر ہی نہیں "خیر کثیر" (بھلائیوں کا ایک ڈھیر، ایک انبار) کہ اس سے زیادہ تسکین دہ اور کون خیال ہوسکتا ہے؟" (صفحہ ۱۸۵، تاج کمپنی لاہور)۔

یہ ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ:
"کوئی ایمان والا شوہر اپنی مؤمنہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا (یا یہ کہ اس کو نفرت نہیں کرنی چاہئے) اگر اس کی کوئی عادت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی (صحیح مسلم)، یعنی پسندیدہ خصلتوں کو نگاہ میں رکھنے سے ناپسندیدہ عادتوں سے (افہام و تفہیم اور اصلاح کا سلسلہ باقی رکھتے ہوئے) صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ یہ حکیمانہ ہدایت ایسی تعلقات کو نبائے رکھنے میں جس قدر مؤثر ہے، اس کا اندازہ ہر صاحبِ فہم و بصیرت کر سکتا ہے۔

۳۔ اسلام نے مرد کو مذکورہ بنیادی ہدایت دینے کے ساتھ عورت سے بھی کہا ہے کہ معمولی معمولی بات پر طلاق کا مطالبہ لے کر نہ بیٹھ جائے، اگر وہ دیکھے کہ شوہر اس سے بے رخی برت رہا ہے تو اپنے حقوق کے مطالبہ اور اس پر اصرار کی جگہ حقوق کو چھوڑ دینے کے لئے بھی تیار رہے، شوہر سے صف آرائی کی جگہ صلح صفائی کی امکانی کوشش کرے (دیکھئے سورۃ النساء، آیت ۱۲۸)

فقہاء نے لکھا ہے کہ بیوی کے حق شوہر پر دو طرح کے ہوتے ہیں:
ایک ثابت و مستقل مثلاً رقمِ مہر، دوسرے وہ جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں، مثلاً نفقہ یا ہمبستری، صلح کے لئے عورت دستبرداری دونوں قسم کے حقوق سے کر سکتی ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ قسمِ اول کے حقوق میں نقضِ صلح کا اختیار نہ رہے گا یعنی جو چھوڑا وہ ساقط ہو گیا جب کہ دوسرے قسم کے حقوق میں بیوی کو یہ اختیار باقی رہے گا کہ وہ جب چاہے کسی چھوڑے ہوئے حق کا مطالبہ از سرِ نو کر دے۔ اس موقع پر قرآن نے " وَالصُّلح

خَیْرٌ" (اور صلح بہرحال بہتر ہے) کے ذریعہ اس طرف توجہ دلائی ہے کہ دونوں کے درمیان تفریق ہونے سے اس طرح کا صلح ہوجانا بہتر ہے۔

۴۔ اگر بیوی بغاوت، نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہوجائے تو اس شکل میں شوہر کو تعلیم ہے کہ فوراً غصہ میں آکر کوئی سخت معاملہ نہ کرے اور طلاق دے کر علیحدہ نہ کرے، بلکہ نرمی اور آشتی سے سمجھائے۔ اگر عورت شریف طبیعت ہے تو کافی ہوجائے گا، بصورتِ دیگر اصلاحِ حال کے لئے عورت کے مزاج، طبیعت، ماحول اور علاقہ کی رعایت کرتے ہوئے چند" تادیبی کارروائیوں" کی ہدایت دی گئی ہے۔ سورۂ نساء کی جس آیت (۳۴) میں یہ مضمون درج ہے، اس کے مطالعہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان پیش آمدہ مسئلہ کو ممکنہ حد تک یہ دونوں بطورِ خود حل کرلیں اور گھر کی بات گھر ہی میں رہے، باہر نہ جانے پائے۔

۵۔ اگر دونوں کے اندر دوری زیادہ ہوگئی ہے اور بطورِ خود اپنے اس مسئلہ کو حل نہیں کرسکتے ہیں تو یہ موقع بھی ایسا نہیں ہے کہ رشتۂ ازدواج جیسے اہم ترین رشتہ پر بے پروائی سے فوری طور پر ضرب لگادی جائے بلکہ دونوں طرف کے سمجھ دار آدمی آگے آئیں اور مصالحت و مفاہمت کی کوشش کریں، اس سلسلہ میں قرآن کی جو آیت (النساء ۳۵) ہے اس سے واضح ہے کہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ نیت مصالحت و مفاہمت کی ہوگی تو اللہ تعالیٰ نیت میں برکت ضرور دے گا اور قلب کی صفائی کی کوئی صورت نکال دے گا۔

۶۔ ان ساری کوششوں میں ناکامی کے بعد طلاق کا موقع آتا ہے، گویا اسلامی شریعت میں بالکل نازک حالات اور انتہائی درجہ کی مجبوریوں اور

شدید ضرورتوں کے وقت ہی آخری چارۂ کار کے طور پر (صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرنے کے لئے) طلاق کا استعمال جائز قرار دیا گیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس کو "ابغض المباحات" اور "ابغض الحلال الی اللہ" (اللہ کے نزدیک مباح اور حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ) فرمایا گیا ہے۔ تاہم ناموافقت کی آخری صورت میں ان دونوں کے بلکہ پورے خاندان کے حق میں بہتر ہے، اس موقع پر مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز کا خیال بے سود ہے۔ اللہ کسی کے کام کو کسی سے اٹکائے نہیں رکھتا، وہ بغیر کسی بندہ کی شرکت اور مدد کے ہر ایک کا کام چلا دینے کے لئے کافی ہے قرآنی آیت "لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا" (شاید کہ اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے) (الطلاق: ۱) اور "وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ" (اور اگر دونوں جدا ہی ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنے (فضل کی) وسعت سے بے نیاز کر دے گا" النساء: ۱۳۰) میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

۷۔ جیسا کہ معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں طلاق ہی ناپسندیدہ عمل ہے مگر ایک مجلس میں تین طلاق تو نہایت مجرمانہ فعل ہے، اس سے بچنا چاہئے غصہ کے وقت جذبات کو قابو میں رکھنا، انسان کی انسانیت اور شرافت کا کمال ہے۔ اگر وقتی طور پر کوئی شخص جذبات کے دھارے میں بہہ رہا ہو تو اسے چاہئے کہ اس وقت بھی جوش میں آکر ہوش کھو نہ بیٹھے، شریعت کا حکم ہے کہ ایسی حالت میں ایک طلاق دے، وہ بھی طہر (پاکی) کی حالت میں۔

تین طلاق اور ایک طلاق کے سلسلہ میں "خاتونِ اسلام" کے مصنف

نے اسلامی شریعت کی ترجمانی متوازن انداز میں اس طرح کی ہے :

"طلاق بذاتِ خود اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض حلال طلاق ہے۔ اس کے بعد اگر آدمی ایسا کرے کہ وہ ایک ہی وقت میں تین طلاق دیدے تو یہ حد درجہ سرکشی کی بات ہے، شریعت میں اس کو بے حد بُرا قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ جب ان کے پاس ایسا شخص لایا جاتا جس نے اپنی عورت کو بیک وقت تین طلاق دی ہو تو وہ اس کی پیٹھ پر کوڑا مارتے تھے۔ (كان عمر بن الخطاب اذا اتى برجل طلق امرأته ثلاثاً اوجع ظهره ۔ التفسير المظهري)

جو شخص نکاح و طلاق کے معاملہ میں اسلام کے اصول پر چلنا چاہے، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ مذکورہ اصول کی پابندی کرے، تین طہر میں طلاق دینے کا یہ طریقہ حد درجہ فطری اور مناسب ہے، اس طریقہ میں وہ تمام طلاق اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں جو وقتی جذبہ کے تحت پیدا ہوئے ہوں، غصہ اور جوش میں اگر آدمی کے اندر طلاق کا ارادہ پیدا ہو گیا ہو تو وہ ایک مہینہ یا دو مہینہ میں اپنے آپ ختم ہو جائے گا، ذہن میں اعتدال آتے ہی آدمی اپنے پچھلے جذبہ پر پچھتائے گا اور اس سے رجوع کرکے اپنی بیوی سے دوبارہ تعلقات درست کرلے گا۔ البتہ اگر طلاق کا سبب بہت زیادہ بنیادی ہو اور آدمی نے سوچ سمجھ کر علٰحدگی کا فیصلہ کرلیا ہو تو وہ دو مہینے گذرنے کے بعد بھی اپنے فیصلہ پر باقی رہے گا، اس کے بعد جب تیسرے مہینہ وہ آخری بار جدائی کا اعلان کرے گا تو وہ حقیقی جدائی ہوگی، وہ مصنوعی جدائی نہ ہوگی، جس پر آدمی ساری

عمر افسوس کرتا رہے۔" (صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۵)

ایک صاحب طلاق کے سلسلہ میں اپنے ایک وکیل سے مشورہ کے لئے گئے، مخلص اور ہمدرد وکیل نے اپنے مؤکل کو جو ہمدردانہ و مخلصانہ مشورہ دیا، وہ بلاشبہ اہم واقعہ ہے۔ یہ واقعہ صرف وکلاء حضرات ہی کے لئے نہیں بلکہ سماجی مصلحین کے لئے بھی عبرت و موعظت کا پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ "خاتونِ اسلام" کے مصنف نے لکھا ہے:

" دہلی کے ایک مسلمان وکیل نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا، ان کے یہاں ایک مسلمان آئے۔ انہوں نے بتایا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں، آپ طلاق نامہ کا مضمون بنا دیجئے، مذکورہ مسلمان اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق دینا چاہتے تھے ——— وکیل صاحب اسلام کے قانون کو جانتے تھے، انہوں نے مذکورہ مسلمان سے کہا کہ ایک وقت میں تین طلاق دینا اسلام میں سخت بُرا ہے، آپ کو اگر طلاق دینا ہے تو اسلام کا مقررہ طریقہ کے مطابق تین طہر میں اس کی تکمیل کیجئے، وہ راضی ہو گئے۔ واپس جاکر انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تم کو ایک طلاق دیتا ہوں۔ مگر جب اگلا مہینہ آیا تو ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے تھے، انہوں نے اپنے سابقہ فیصلہ سے رجوع کر لیا اور اپنی بیوی سے دوبارہ تعلقات قائم کر لئے۔ وہ وکیل صاحب سے دوبارہ ملے اور کہا کہ آپ نے میرے ساتھ بہت احسان کیا، حقیقت یہ ہے کہ اگر میں نے جوش کی حالت میں اپنی بیوی کو اسی وقت آخری طلاق دے دیا ہوتا تو میرا گھر برباد ہو جاتا۔" (صفحہ: ۲۲۶)

معلوم ہوا کہ اسلام نے طلاق کی اجازت تو ضرور دی ہے، لیکن

وہ چاہتا ہے کہ محض جذبات کی رو میں آدمی بے سمجھے طلاق نہ دے بیٹھے، اور بعد میں اسے پچھتانا پڑے، بلکہ طلاق کا فیصلہ ہو تو انتہائی سنجیدگی سے اور غور و فکر کے بعد ہو، مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر ایسے موقع پر "اقدام طلاق" سے پہلے کسی صاحب الرائے عالم دین سے مشورہ بھی حاصل کرلیا جائے۔ پھر ایک اہم بات یہ ہے کہ طلاق دینے کا صحیح اور غلط طریقے بھی ہے۔ جس سے واقفیت اور باخبری بھی ضروری ہے، بلاشبہ مسلم معاشرے میں طلاق کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے، جس کی طرف علماء اور مصلحین کو توجہ کرنی چاہیئے، اور بعض غیر ضروری اور ازکار رفتہ مسائل کو موضوع بحث بنانے کی بجائے اس طرح کے معاشرتی اور سماجی مسائل پر نظر کو مرکوز کرنی چاہیئے۔

مولانا آزاد کا ایک بصیرت افروز خط

ازدواجی زندگی سے متعلق ایک مسئلہ میں حکیمانہ مشورہ

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء) کا شمار نابغۂ روزگار اور نادرِ زمانہ ہستیوں میں ہوتا ہے جس پہلو اور جس زاویہ سے ان کی زندگی کو دیکھا جائے، انسان سے بھری آبادی میں ان کی شخصیت کا قد ان کے تبسانی قد ہی کی طرح اونچا نظر آتا ہے۔ دین، ادب، علم، تحقیق، صحافت، خطابت، قیادت، سیاست، سب میں انہوں نے اپنی صلاحیت، قابلیت اور پُرکشش شخصیت کا جادو جگایا ہے، خطوط نویسی میں بھی ان کا انداز سب سے نرالا ہے، پڑھتے جائیے اور سر دھنتے جائیے، کہیں سے بھی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا، خطوط لکھتے ہوئے الفاظ کے محل میں معانی کی دنیا اس طرح سجاتے ہیں کہ دل اور نگاہ دونوں ہی اپنی اپنی مراد پالیتے ہیں خط میں مکتوب الیہ کے مقام و مرتبہ کی رعایت بھی ہوتی ہے اور ان کے لئے موقع کے لحاظ سے نصیحت، مشورہ اور پیغام بھی۔ اپنے مضمون کی تائید میں قرآن حکیم کی آیات اور شعراء کے اشعار کو اس طرح لاتے ہیں کہ جیسے کسی شخص نے خوبصورت انگوٹھی میں خوبصورت نگینہ خوبصورتی کے ساتھ بٹھایا ہو، یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر کی طرح ان کی ہر نوعیت کی تحریر میں بھی "از دل خیزد بر دل ریزد" (دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے) کے محاورہ کی روح وجد کرتی نظر آتی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ذیل میں ہم مولانا آزادؒ کا ایک خط نقل کر رہے ہیں، یہ خط مولانا نے جناب محمد ابراہیم زکریا عرف مسٹر کے نام لکھا تھا، یہ خط عام طور پر لوگوں کی نظر میں نہیں ہے چند سال بیشتر پروفیسر محمود واجد ہاشمی کی جستجو اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کی وجہ سے بعض رسائل و جرائد میں طبع ہوا تھا۔ آپ جب خط پڑھیں گے تو خود محسوس کریں گے کہ اختصار کے باوجود معارف کا سرچشمہ

بصائر و حکم کا گنجینہ اور نہایت روح پرور اور ایمان افروز ہے۔

مکتوب الیہ (جناب محمد ابراہیم زکریا عرف مسٹر) نے مولانا آزاد کو جو خط لکھا تھا، اس کا متن مولانا آزاد کے جوابی خط کے ساتھ نہیں ہے۔ تاہم مولانا کے خط کے بین السطور سے ضمناً ظاہر ہے کہ مکتوب الیہ (جن کو خط لکھا گیا ہے) شادی شدہ ہیں، بچے بھی ہیں، معاشی حالت بھی بہتر نہیں ہے۔ دنیا میں کچھ کرنے کی آرزو بھی رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں، پوری چھپے تعلقات رکھنے میں شریعت حائل ہے، خوفِ خدا اور خوفِ آخرت دامنگیر ہے۔ موجودہ بیوی اور بچوں کا مسئلہ بھی درپیش ہے، اندیشہ ہے کہ بیوی ناراض نہ ہو جائے اور بچے روٹھ نہ جائیں، پھر ان بچوں کا تعلیمی و تربیتی مستقبل خطرہ سے دوچار نہ ہو جائے۔ ڈر یہ بھی ہے کہ اپنی عسرت اور تنگی کی وجہ سے دو بیویوں اور ان سے وابستگی کے بعد جو مسائل پیدا ہوں گے، انہیں سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جب کہ دنیا میں کچھ اچھے کام کرنے کا جذبہ بھی ہے۔ یہ تشویش بھی لاحق ہے کہ جس لڑکی کی محبت میں مکتوب الیہ گرفتار ہیں اس لڑکی کے والدین مکتوب الیہ سے نکاح کرنا بھی پسند کریں گے یا نہیں؟ لیکن لڑکی کی محبت ہے کہ اس نے مکتوب الیہ کے دل و دماغ کو بے چین کر رکھا ہے۔ گویا مکتوب الیہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں اور دوراہے پر کھڑے ہوئے ہیں، اس صورتِ حال میں انہوں نے مولانا آزاد سے خط لکھ کر مشورہ طلب کیا کہ وہ کیا کریں؟ گویا مکتوب الیہ کو اپنے ایک دینی، شرعی، اخلاقی و نفسیاتی مسئلہ میں مولانا آزاد کی رائے مطلوب ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کی صراحت کے بموجب مولانا آزاد کے خط سے اس کے زمانے اور تاریخ کی قطعیت ظاہر نہیں ہوتی، لیکن انہوں نے اپنے قیاس سے لکھا ہے کہ:

"مولانا آزاد کی پیدائش ۱۸۸۸ء کی ہے اور شادی ان کی بہن کی روایت کے مطابق ۱۲، ۱۴ برس کی عمر میں ہوئی تھی، اس خط میں مولانا نے لکھا ہے: "میری شادی کو دس سال ہو گئے"۔ اس حساب سے خط کا زمانۂ تحریر ۱۹۱۲ء ہوتا ہے۔ مکتوب الیہ کی روایت کے مطابق مولانا آزاد سے ان کے تعلقات کا آغاز بھی اسی سال سے ہوا تھا، گویا کہ مولانا کا یہ خط مکتوب الیہ سے تعلقات کے اوائل کی یادگار ہے۔"

اب آپ مولانا آزاد کا خط توجہ، یکسوئی اور حاضر ذہنی کے ساتھ پڑھیے اور دیکھیے کہ عائلی اور ازدواجی زندگی سے متعلق ایک مسئلہ میں مولانا کس قدر واضح حکیمانہ اور دردمندانہ مشورہ دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

عزیزی : السلام علیکم۔

جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے، تخصیص و تعین کے ساتھ تو اس کا علم نہ تھا لیکن یہ معلوم تھا کہ اس طرح کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری ہر حالت کو موجب صلاح و فلاح فرمائے۔ یقین کیجیے کہ دنیا میں انسان کے تمام قوائل و فضائل کے لئے اصلی آزمائش گاہ یہی حالات ہیں۔ تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں۔ سب سے بڑی آزمائش نفس و جذبات ہی کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور قوتِ ایمانی و احسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی مشکل نہیں۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ٥ (العنکبوت ۶۹)

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے۔ اور بیشک اللہ خلوص والوں کے ساتھ ہے۔

میں اپنی دعاؤں میں کبھی نہیں بھولوں گا، اللہ تعالیٰ آپ کو اس آزمائش میں کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔ موجودہ حالات میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں۔

عزمِ صادق اور ہمتِ کامل سے کام لیجیے۔ اپنے اندر عزم پیدا کیجیے اور اللہ سے مددگاری طلب کیجیے۔ زندگی چندروزہ ہے اور سارے مطلوباتِ نفس وہم خیال سے زیادہ نہیں، کب تک اس بند و قید میں گرفتاری رہے گی؟ جو دل "فاطر السموٰت والارض" کے عشق کا متحمل نہیں ہو سکتا اس کو فانی و وہمی الفتوں میں لگانا انسانیت و حیات کو تاراج کرنا ہے۔ طلبِ مفرط (حد سے خارج خواہش) جس چیز کی بھی ہے، انداد و طواغیت (شرک، نفسانیت، شیطانیت) میں داخل ہے۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ (البقرہ ۲۲) ترجمہ: ایسا نہ کرو کہ اس کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک اور ہم پایہ بناؤ اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور

و من الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونہم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حباللہ (البقرہ ۱۶۵) ترجمہ اور دیکھو انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے بھی ہیں جو خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو اس کام کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں۔ جیسی چاہت اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ حالانکہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے دلوں میں تو سب سے زیادہ محبت اللہ ہی کی ہوتی ہے:

محبت الٰہی کا دعویٰ ہے تو سب سے زیادہ اَحب چیز کو اس کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (آل عمران ۹۲) ترجمہ: جب تک تم اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کرو گے۔ کامل نیکی کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکو گے:

پس اصلی و حقیقی اور ایمانی و احسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگائیے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸) ترجمہ: اور یاد رکھو یہ اللہ کا ذکر ہی ہے جس سے دل کو چین اور قرار ملتا ہے (اور شک و شبہ اور خوف و غم کے سارے کانٹے نکل جاتے ہیں) ــــــــ اور ایک مرتبہ پوری قوت و عزم کے ساتھ "اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا" (الانعام ۷۹) ترجمہ: میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی ہستی کی طرف اپنا رخ کر لیا ہے (جو کسی کی بنائی ہوئی نہیں، بلکہ آسمان اور زمین کی بنانے والی ہے (اور جس کے علم اور قانون پر آسمان اور زمین کی تمام مخلوقات چل رہی ہیں") اور "لا احب الآفلین" (الانعام ۷۶) ترجمہ: میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں") کی صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجئے، اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی اور ان شاء اللہ ایک جہاد اکبر اجر عند اللہ۔

غور کیجئے آپ متاہل ہیں، مجرد نہیں، پھر صاحب اولاد اور حقوقِ اہل و عیال کی کشاکش سے درماندہ، کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی ازدواج ثانی کے لئے باعث نہیں، پھر ایک طرف افلاس و قلت معیشت کی بے سروسامانی، دوسری طرف عوازم و معالی، امور و عمل کا ولولہ، ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام دیا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلاشبہ ابتدا میں مسرت، حصول مطلوب کا ہیجان

تمام محسوسات پر غالب آجائے گا۔ لیکن بہت تھوڑی دیر کے لئے اس کے بعد قدرتی کش و کشمکش و مشکلات و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیساکہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے۔ عجب نہیں کہ خود اس معاملہ سے دل برداشتہ ہو جائے۔

یہ کشاکش زندگی کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے، ابھی ایک مدت کے لیے اس کا احساس نہیں ہوسکتا، یہ عام قاعدہ ہے، لیکن جب یہ حالت پیش آجائے گی تو کوئی علاج سودمند نہ ہوگا سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصائب پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔

دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے جس کے مصائب و مشکلات کا ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کے لئے مہیا نہ کرسکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو اس سے کوئی شکایت نہیں، کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے، کہ بلا وجہ اس کی بقیہ زندگی تلخ کردی جائے۔

میری شادی کو دس سال ہو گئے، یقین کیجئے کہ میرے لئے ایک نہیں متعدد وجوہ و بواعث شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں، اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا۔ بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لئے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا، پھر دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا، تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا، صداقتِ حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کرسکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے، نہ سچائی اور نہ انسان۔

آپ کہیں گے کس کے بس میں ہے؟ ہاں لیکن جو چاہے اس کے بس میں ہے، دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے اس کو جگا دیجئے، سونے نہ دیجئے، وہ دل کی لگام جس طرف چاہے

موجود رہے گی۔

اس بارے میں کثرت سے عواقب و نتائج پر غور و تفکر، مطلوبات نفس کی ہیچ مائیگی اور بے حاصلی کا تصور، کثرت استغفار و دعا اور مشغولات دینیہ نہایت سودمند ہیں، اگر ایک دعا بھی پورے اضطراب و التہاب کے ساتھ نکل گئی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک مرتبہ پوری طرح لگ جائے کہ طلب و عشق اور اضطراب قلب و اشک چشم جیسی نعمتیں ایک وہمی و خیالی مطلوب کے لئے کس طرح ضائع جا رہی ہیں اور اگر یہ سب کچھ اللہ کے لئے ہو جائے تو پھر یہی وجود فانی کیا کچھ نہیں کر سکتا، اور اس آزمائش سے نکل جانے میں ذرا بھی رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔

لیکن اگر ضعف عزم آپ کا ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے تو پھر دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام خیالات چھوڑ کر بھاگلپور چلے جائیے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجئے اور جس قدر مشکلات و مہالک پیش آئیں گے ان کو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیجئے، یہ بات پھر بھی ہزار درجے موجودہ اضطراب نفس سے بہتر ہو گی اقلاً بہت سے انتہائی نقصانات مفقود ہو جائیں گے۔

غرضیکہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالئے، یا فوراً بلا تاخیر جا کر کسی نہ کسی طرح نکاح کر لیجئے۔ تیسری حالت کوئی نہیں اور اگر اختیار کی جائے گی تو سخت مضر ہو گی۔ والعاقبۃ للمتقین۔

ابو الکلام آزاد

(اقتباس خط ختم)

مولانا آزاد کا یہ خط دین و دانش اور عقل و تجربہ دونوں کا نچوڑ ہے۔ اس خط کی حیثیت جہاں تاریخی علمی اور ادبی ہے، اس کے ساتھ یہ خط ایک اہم سماجی مسئلہ کو حل کرنے میں سنگ میل کا درجہ بھی رکھتا ہے، آج کے آزادانہ ماحول اور بے حجابانہ میل جول اور اختلاط مرد و زن سے

لڑکوں اور لڑکیوں مردوں اور عورتوں کے درمیان عشق و محبت کی ایک ایسی آگ لگا رکھی ہے، کہ "بجھائے نہ بجھے" آج کل عشق کے ماروں کو مختلف انداز سے "خودکشی" منظور ہے۔ لیکن جذباتیت اور ہیجان انگیزی سے نکل کر حقیقت و واقعیت، صداقت و امانت اور پاک دامنی کے محل کی طرف آنا گوارا نہیں۔ مولانا آزاد نے دین و شریعت کے جو گھٹے ہیں جس اونچی سطح سے اس مسئلہ کو سلجھایا ہے، اور ایک ماہر نفسیات اور سماجی طبیب کی حیثیت سے "بیماریٔ عشق" کو جس طرح کی دوا دی ہے۔ یہ ان جیسے کا ہی حصہ ہے۔ مولانا آزاد کے خط کا اگر تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو درج ذیل حقائق و معارف اور حکیمانہ نکات کھل کر سامنے آتے ہیں جن کو نگاہوں سے چن کر عملی جذبے کے ساتھ دل میں جگہ دینے کی ضرورت ہے۔

(الف) مرد و زن کے آزادانہ ماحول اور باہمی اختلاط سے آنکھیں تو اپنا کرشمہ دکھاتی ہیں اور دل محبت کے دلدل میں پھنس کر جن مفاسد اور خرابیوں کے لئے دروازہ کھولتا ہے اس پر پہرہ کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں سب سے مضبوط پہرہ اسلامی شریعت فراہم کرتی ہے، شرعی پردہ اسی پہرہ کی عملی شکل ہے۔

(ب) نادانی کی ناجائز محبت ذہنی انتشار اور فکری خلجان کا باعث ہے۔ اس صورت میں دلچسپی اور یکسوئی کے ساتھ انسان کوئی کام نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ محبت کی شادی کامیاب کم اور ناکام زیادہ ہوتی ہے۔

(ج) جو دل "فاطر السمٰوٰت والارض" (آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا) کے عشق کا متحمل ہو سکتا ہے اس کا فانی اور وہمی الفتوں میں لگانا انسانیت و حیات کو تاراج کرنا ہے۔

(د) محبت الٰہی کا دعویٰ ہے تو سب سے زیادہ محبوب چیز کو اس کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔

(ہ) اصلی و حقیقی ایمانی و احسانی راہ یہی ہے کہ اللہ سے دل لگایا جائے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اور انی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا کے ورد سے ہر خیالِ غیر و فکرِ باطل کو دل سے نکالا جا سکتا ہے۔

(ی) تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں، سب سے بڑی آزمائش نفس و جذبات ہی کی ہے، اگر عزمِ راسخ اور قوتِ ایمانی و احسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔

(ز) اگر انسان کی جانب سے عزم ہو تو توفیقِ الٰہی ضرور مددگار ہوتی ہے۔

(ح) کوئی شرعی اور اخلاقی ضرورت ہو تب ہی دوسری شادی کے لئے اقدام کرنا چاہئے بصورت دیگر پشیمانی اور پریشانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

(ط) نفس پرستی اور ہوسناکی کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

(ی) دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر معصوم لڑکی سے ناجائز محبت کرکے اس کی زندگی کو تباہ نہیں کرنا چاہئے۔

(ک) چوری چھپے کے ناجائز تعلقات ہر دو (لڑکا۔ لڑکی۔ عورت، مرد) کو بدحال اور برباد کر دیتے ہیں۔ نکاح کا جائز اور شرعی طریقہ ہی ذہنی اطمینان، دماغی سکون، قلبی راحت اور ہر طرح کی بھلائی کی ضمانت دیتا ہے

(ل) صداقتِ حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان۔

(م) زندگی چند روزہ ہے اور سارے مطلوباتِ نفس وہم و خیال سے زیادہ نہیں۔ آخر کب تک اس بند و قید میں گرفتاری رہے گی! سب کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی کے سامنے آخرت میں حاضر ہونا ہے اور اپنے کئے کا حساب دینا ہے، اس لئے ہمیشہ والی راحت کو عارضی لذت پر ترجیح دینا چاہئے۔

(ن) اپنے عواقب و نتائج (انجام) پر کثرت سے غور و فکر کرنا چاہئے، مطلوباتِ نفس کی ہیچ مائیگی اور بے حاصلی کا تصور بھی کرتے رہنا چاہئے، نفس اور غیر شرعی خواہش کے دباؤ میں آنے اور اس کے حملہ سے بچنے کے لئے کثرتِ استغفار و دعا اور مشغولیات دینیہ نہایت سودمند ہیں۔ اگر ایک دعا بھی پورے اضطراب والتہاب (خشوع و خضوع، ذوق و شوق بے چینی و بے قراری) کے ساتھ نکل جائے تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مذکورہ خط میں ایک اور نہایت فکر انگیز اور معنی خیز جملہ ہے، اسی جملہ پر اس مطالعہ خط کو ختم کیا جارہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: "دل سے او پر بھی ایک طاقت ہے، اس کو جگا دیجئے، سونے نہ دیجئے، وہ دل کی لگام جس طرف چاہے گی، موڑ دے گی" ۔۔۔۔

قائد کا کردار

مولانا آزاد کے فکر و عمل کی روشنی میں

ماضی قریب کی ہندوستانی شخصیتوں میں جن کی حیثیت "نابغۂ روزگار" (زمانہ کا قابل ترین آدمی) کی رہی ہے، ان میں ایک اہم اور ممتاز نام مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸) کا بھی ہے، جن لوگوں نے ان کو دیکھا یا پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ گوناگوں خوبیوں اور کمالات کے حامل تھے۔ محرم اسرار دین تھے، مفسر قرآن تھے، محدث تھے، فقیہ تھے، فلسفی تھے، مؤرخ تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، انشاء پرداز تھے، اخبار نویس تھے، سیاسی مدبر تھے، مجاہد حریت تھے، ان تمام حیثیتوں کے ساتھ ان کی ایک حیثیت قومی لیڈر اور قائد کی بھی تھی۔ اپنی اس حیثیت کے اعتبار سے بھی وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی جملہ حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ :

؎ بھلا سکیں گے نہ اہل زمانہ صدیوں تک
میری وفا کے، میرے فکر و فن کے افسانے

قائد ـــــ معنی و مفہوم

جہاں تک تعلق "قائد" کا ہے تو یہ عربی لفظ ہے، جس کے معنی رہنما، سردار اور حاکم کے ہیں، اندھے کی لاٹھی پکڑ کر اس کو راستے پر لے جانے والے کو بھی قائد کہتے ہیں، اس گھوڑے اور اونٹ کو بھی قائد کہا جاتا ہے جو قطار میں سب سے آگے چلتا ہے، لفظی اصطلاحات کے ماہرین نے لکھا ہے کہ معنوی اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے، جو بغرضِ رہنمائی آگے چلے، ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے قائد، جس کے پیچھے قوم چل رہی ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ "منزل آشنا" ہو اور منزل کی سمت سفر جاری رکھتے ہوئے اس پر نگاہ رکھے کہ دشمنوں اور رہزنوں کی کمین گاہیں کہاں کہاں ہیں، وہ آگے آگے چلتے ہوئے اپنے پیچھے چلنے والے ساتھیوں کو راستہ کے نشیب و فراز اور پیچ وخم سے آگاہ بھی کرتا رہے تاکہ اس کے یہ ساتھی نہ تو بھٹکنے پائیں اور نہ ہی ان کو ٹھوکر لگے، یعنی قائد نہایت باخبر، چوکنا، ہوشیار، مزاج شناس، نباض وقت، مدبر، معاملہ فہم، بالبصیرت باحوصلہ، عزم وہمت کا پیکر، بروقت اقدام کی صلاحیت کا حامل، قوم کا ھمدرد وغمگسار اور بااخلاق و باکردار ہوتا ہے، بقولِ حالی:

ے نہ گفتار میں ان کی کوئی خطا ہے
نہ کردار ان کا کوئی نا سزا ہے

قائد کا رختِ سفر

قائد کو "رختِ سفر" کی بھی ضرورت ہے، تو اس کا رختِ سفر "مرغن غذائیں" یا "قوم کے غم میں ڈنر کھانا" نہیں بلکہ عظیم و بلیغ

فکر و نظر کے حامل شاعر علامہ اقبالؔ نے رختِ سفر کی جو نشاندہی کی ہے وہ "نگہ کی بلندی، سخن کی دلنوازی اور جاں کی پرسوزی" ہے، اس کا سارا سفرِ قیادت اسی کے سہارے طے ہوتا ہے۔ اسی طرح قائد بات بات میں الجھتا نہیں، پٹرول کی آگ کی طرح جلد بھڑکتا نہیں، انتقامی جذبات سے اس کا سینہ بھرا ہوا کبھی نہیں ہوتا، وہ کان کا کچا بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ہم نشینوں کی ہر بات کو حسن و قبح اور خیر و شر کی میزان میں تولے بغیر قبول کرے اور ان سے ہمیشہ تعریفی کلمات اور خوشامدانہ باتوں کو ہی سننے کا آرزومند ہو (آجکل زیادہ کام جو بگڑ رہا ہے وہ مصاحبِ بے تدبیر، ہمنشینِ بے توفیق اور مشیرِ بے فہم سے) قائدؔ کی سب سے بڑی صفت اس کا "صبر و تحمل" اور "حقیقت پسندانہ مزاج" ہے اپنی اسی صفت کی وجہ سے وہ اپنے مخالفین اور معاندین کی باتوں کو قابلِ اعتنار قرار نہیں دیتا۔ وہ اعراض چشم پوشی اور عفو و درگذر کی پالیسی کو اختیار کرتا ہوا مثبت کام کے وسیع و عریض میدان پر نگاہ رکھتا ہوا سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزادؔ ہمارے قائدین (خواہ ان کی قیادت کا دائرہ چھوٹا ہو یا بڑا اور زندگی کے کسی بھی شعبہ میں وہ قائدانہ رول ادا کر رہے ہوں) کے لئے بہترین مثال ہیں۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پسِ منظر میں اس مثال سے فائدہ اٹھانا، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

معاندانہ تنقید سے اعراض

آپ نے مشہور ادیب، مصنف، صاحبِ قلم اور ماہر اسلامیات جناب

مالک رام کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ ان کا انتقال ۱۰ اپریل ۱۹۹۳ء کو ہوا ہے، ہے۔ یہ مولانا آزادؔ کے عقیدتمندوں میں سے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ہے "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں"۔ اس میں انہوں نے ایک جگہ اپنے کراچی کے سفر کی روئیداد لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ یہاں ایک ملاقات میں مشہور صاحب قلم اور شاعر ماہر القادری نے اپنا ماہنامہ (فاران، شمارہ مئی ۱۹۵۱ء) دیا اور کہا کہ اس میں ایک مضمون "پردہ اٹھتا ہے" کے عنوان سے ہے اسے ضرور پڑھیئے۔ اس مضمون میں مولانا آزادؔ کے وطن، تعلیم، خاندان اور اسفار وغیرہ کے بارے میں سخت معاندانہ تنقید تھی، مالک رام صاحب کراچی سے دہلی واپس ہوئے تو ایک دن مولانا آزاد کی خدمت میں آئے اور گفتگو کے دوران اس مضمون کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ سے بعض معلومات درکار ہیں تاکہ آپ کے خلاف لکھے ہوئے اس مضمون کا جواب دے سکوں، اس خواہش کے جواب میں مولانا آزادؔ نے جو کچھ فرمایا اس کے بارے میں مالک رام صاحب کا احساس اور تأثر یہ ہے کہ "وہ میری زندگی کے لئے رہنما اصول بن گیا"۔ مولانا نے جواب لکھنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے ہوئے فرمایا :-

"کیا آپ کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے کہ آپ کو لوگوں کے اعتراضات کا جواب لکھنے کی سوجھی ہے، یہ بالکل فضول اور بے کار کام ہے۔ اگر معترض نے کوئی صحیح بات لکھی ہے تو اپنی اصلاح کر لیجئے اور اگر غلط لکھا ہے تو اس سے درگذر کیجئے۔ اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا اور تلخی میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس سے جو

وقت بچے گا اس میں کوئی اور مفید کام کیجئے "

(کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں، صفحہ ۱۴۰)

شاید مولانا آزاد اس مسلک کے تھے کہ:

ع عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں،

بھلا تم زہر دے دیکھو، اثر ہووے تو میں جانوں

عالی ظرفی

مشہور ادیب، شاعر اور صحافی جناب شورش کاشمیری مرحوم (مدیر چٹان لاہور) نے "ابوالکلام آزاد" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، (۵۱۶) صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ادارہ چٹان لاہور نے شائع کیا ہے زبان وادب اور معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بڑی وقیع ہے، موضوع کی مناسبت سے چند حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ان سے آپ مخالفین ومعاندین کے معاملہ میں مولانا آزاد کی بلند حوصلگی، عالی ظرفی، حلم مزاجی اور عفو و درگذر کی پالیسی کو سمجھ سکتے ہیں، اور یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ایک اچھا قائد لوگوں کے شور وغل اور چیخ و پکار سے بے نیاز ہوکر کس طرح اچھے کام میں جٹا رہتا ہے، شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں:۔

" مولانا آزاد ذکی الحس، شدید الاحساس اور نازک مزاج انسان تھے، اگر عمر کے ابتدائی اٹھارہ بیس سال ان کیلئے شوخ تھے تو اس کے بعد تمام زندگی یکساں رہے کہ ان کا وجود سراپا متانت تھا، بات چیت کی محفلوں میں شگفتہ

ہوتے یا قرطاس وقلم کی صحبتوں میں، فرمایا: الہلال کے ابتدائی دور میں بعض محرکات ایسے تھے کہ بعض اداروں کے معاملے میں قلم ذرا شوخ رہا لیکن پھر محسوس کیا کہ یہ راہ غلط ہے تو اس سے ہاتھ اٹھا لیا۔"

ہر دور میں لوگوں نے رکیک سے رکیک حملے کئے اور جو منھ میں آیا کہہ ڈالا، لیکن آپ نے ذاتیات کے مباحث اپنے قلم اور زبان کے لئے شجر ممنوعہ ٹھہرا لئے اور ان سے عمر بھر بے نیاز رہے، کسی کو رسید ہی نہ دی۔

جناب عبدالرزاق ملیح آبادی نے "ذکر آزاد" میں ۴ر نومبر ۱۹۲۸ء کا ایک خط نقل کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب علی برادران سے تعلقات منقطع تھے اور وہ ان پر کہیں نہ کہیں ایک آدھ جملہ کس دیتے تھے، اس خط میں لکھتے ہیں:

> "بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ اپنے کسی مضمون میں آپ (ملیح آبادی) نے شوکت علی صاحب کو بہت برا لکھا ہے، جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی کوئی تحریر اس قسم کی نہ نکلی ہوگی، بہرحال اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ شخصاً کسی کی برائی نہ کی جائے اور جو کچھ لکھا جائے اعتدال سے باہر نہ ہو۔"

جذبات کو قابو میں رکھنے کی ضرورت

ایک سیاسی جماعت نے مولانا کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا ہے وہ گالی گفتار کی انتہا پر تھا، نیاز مند قدرتاً اس پر برہم تھے، ترجمان،

احرار اور روزنامہ آزاد بھی جواباً طعن و طنز کی زبان استعمال کرنے لگے، مولانا کو پتہ چلا تو راقم کو بلا بھیجا، احقر دہلی پہنچا، فرمایا:-

" زندگی نہ بھڑک اٹھنے کا نام ہے نہ بجھ جانے کا، بلکہ سُلگتے رہنا ہی زندگی کا نام ہے۔ معاملہ سخن گسترانہ ہو تو ٹھیک ہے لیکن برائی کا جواب برائی نہیں، ان کی اپنی زبان ہے اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیے، اگر سب وشتم بھی زبان ہے تو پھر قومی اخلاق کا خدا حافظ ہے، اس سے کوئی عمدہ فصل تیار نہ ہوگی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہنے دو، انہیں شاید حق پہونچتا ہے لیکن اپنی زبان کو آلودۂ دشنام نہ کرو، کبھی سخت و سنگلاخ الفاظ سے قومی معاملات حل نہیں ہوتے، میں جانتا ہوں آپ لوگوں کو مجھ سے اخلاص ہے لیکن اخلاص وارادت کی راہیں دوسری ہیں، طیش و غصہ نہیں، جن لوگوں کو جذبات نے اندھا کر دیا ہے، جو دماغ کے بجائے پیٹ سے سوچ رہے ہیں اور دل کی جگہ زبان سے محسوس کر رہے ہیں، انہیں ایک دن اس کا شدید احساس ہوگا اور تب وہ اپنے ہی تجربوں سے تاریخی سبق حاصل کرلیں گے۔ بہرحال یہ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی ہے کہ آپ لوگ برہنہ دماغوں اور آوارہ زبانوں کے سامنے بازار میں ڈنڑ پیلیں "

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو راقم کی موجودگی میں کہا "شاہ جی! خطابت آپ کو عطیہ الٰہی ہے اور جو چیز عطیہ الٰہی ہو اس میں درشتی نہ ہونی چاہیے۔ جو لوگ حریف بذلہ نہیں، ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے، طعن و طنز کمزور انسانوں کی بیمار زبانوں کا ہذیان ہیں، آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔ آپ کو ان

چھوٹی موٹی ندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگ ریزے اُگلتی اور ریت پھینکتی ہے۔"

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں کسی مسئلے پر کچھ کہہ رہے تھے تو مولانا مظہر علی اظہر کی اس تقریر سے پریشان ہو گئے جس میں انہوں نے قائد اعظمؒ کو کافر اعظم کہا اور ان کے نکاح کا قصہ چھیڑا تھا، فرمایا :-

" یہ سیاسی لڑائی نہیں، ایک ایسی مبتذل (گھٹیا) بات ہے جو الفاظ کی رعایت سے کھٹی تے ہے، تین دفعہ اِنا للہ واِنا الیہ راجعون پڑھا پھر فرمایا" مولوی صاحب آپ بازی ہار گئے ہیں"۔ اس کے بعد فرمایا: "جو لوگ قومی اخلاق کے مبادیات نہیں جانتے وہی اس قسم کی ذاتیات کو زبان دیتے ہیں"

مولانا نے" ترجمان القرآن" میں صبر کے جو معانی بیان کئے ہیں، اس کی ہو بہو تصویر تھے، ان کا وجود فی الواقعہ صبرِ جمیل کا پیکر تھا اور تحمل (قوتِ برداشت) کا حال یہ تھا کہ پہاڑوں کی طرح ژالہ باری سے بے نیاز اپنی جگہ کھڑے تھے، ان میں شکوہ پہاڑوں کا اور تحمل زمینوں کا تھا اور سمندروں کی طرح گہرے تھے، ان کی پشت میں خنجر بھونکے گئے، مسلمانوں نے اپنی نفرت کی واحد آماجگاہ بنالیا لیکن زبانوں کی آوارگی پر اُف تک نہ کی، فرماتے : ان کی عقلوں کو طاعون چاٹ گئی اور ان کے اخلاق کو سرطان ہوگیا ہے، جب حقیقت کا سورج ابھرے گا اور حقائق کھل کے سامنے آئیں گے تو خود بخود معلوم ہوگا کہ سراب کا شکار رہیں! ان کے خلاف کسی نے کیا نہیں کہا؟ لیکن جس نے جو کہا سب کچھ سنا، ہر وار

سہا، فرمایا تو بس اتنا کہ "آندھیوں میں گرد اُڑتی اور طوفان میں پانی اُچھلتا ہے" علی گڑھ کے طلبہ نے ۱۹۴۶ء میں اسٹیشن پر ان سے جو سلوک کیا پھر سرینگر میں بعض منچلوں نے ان کے خلاف جو طوفان اٹھایا، وہ سب ایک غیر شریفانہ عمل تھا۔ ملک کی سیاسی جدوجہد میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا ملک تقسیم ہو گیا تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ ہیں "مولانا آزادؒ سرسید ثانی تھے کہ یونیورسٹی کو ہندوستان کی قیامتِ صغریٰ کے فرقہ وارانہ الاؤ سے نکالا اور اس کا وجود بچا لیا اور یہ سب ان کے صبرو تحمل کی کرامات تھیں"

مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ "وہ لوگ جنہیں قدرت محاسن و محامد سے نوازتی ہے، ان کے مخالف ضرور ہوتے ہیں لیکن ایسے حریف لائقِ اعتنا نہیں ہوتے، انہیں جواب دینے سے جواب نہ دینا ہی بہتر ہے، آدمی مخالفوں سے اُلجھ کر کچھ پاتا نہیں، کھوتا ہے، لڑائی افراد سے نہیں نظریات سے ہونی چاہیئے جو اصولوں کے بجائے آدمیوں سے لڑتے ہیں وہ اپنے افکار و نتائج کو خود گزند پہنچاتے ہیں، فرمایا" مخالفوں سے ذاتیات کی جنگ میں، ہجو ملیح یا ہجو قبیح مزہ تو دیتی ہے مگر یہ ایک ایسا نشہ ہے جیسا بعض لوگ بھنگ پی کر سرور حاصل کرتے، افیون کھا کر سرشار ہوتے اور شیشۂ شراب اٹھا کر ماورائے کائنات چلے جاتے ہیں۔ ادھر نشہ اترتا تو ابکائیاں آنے لگتی ہیں، پھر وہ دن سرعت سے آتا ہے جب محسوس ہوتا ہے کہ صحت کی دیوار گر چکی ہے اور اعضاء ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ

نسخۂ شفا ہے، دشمنوں سے کیا سلوک ہونا چاہیئے وہ سب حضورؐ کے اسوۂ حسنہ میں ہے، اس کے بعد کسی مدرسہ سے سبق لینے کی ضرورت نہیں، ان کی اتباع ہی اس مرض کا علاج ہے۔

میں نے اپنے حریفوں سے اعتنا ہی نہیں کیا، لوگ دین کی مسند پر بیٹھ کر ژاژ خائی (بیہودہ گوئی) کرتے ہیں، سیاست تو دنیوی چیز ہے اور اس کی مثال میکدے کی سی ہے کہ جام ہی نہیں ٹکراتے عمامے بھی اُچھلتے ہیں، مخالفوں کو جواب دینے کا مطلب ہے کہ ہم نے انہیں تسلیم کرلیا اور یہ عشقِ مقصد کی نفی ہے۔"

(تلخیص از مولانا ابوالکلام آزاد، صفحہ ۸۸ تا ۹۷)

متانت وسنجیدگی، ایک متاعِ گرانمایہ

مولانا آزادؒ کے ان واقعات کی روشنی میں معاندانہ رویّہ اور اور حریفانہ چشمک کے موقع پر ایک قائد کا کردار کیا ہونا چاہیئے اس کی عملی شکل سامنے آتی ہے۔ عوام کا قائد سے یا قائد کا قائد سے اختلاف کے موقع پر متانت، سنجیدگی اور شرافت وانسانیت کے دامن کو چھوڑ دینا اور بے تحقیق، بے سند باتوں کو منسوب کرنا یا اندرونِ خانہ جھانک کر ذاتیات پر اُتر آنا، کسی اچھے، صالح اور پڑھے لکھے معاشرے کی علامت نہیں ہے، کسی کو گالی دینے کا مطلب یہ ہے کہ گالی سننے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ خصوصیت کے ساتھ معاشرے کے وہ افراد واشخاص یا قائدین جن کی اپنی ایک "حیثیت عرفی" بنی ہوئی ہو اور کسی نیشنل یا انٹرنیشنل سطح کی تنظیم سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ

ہوں، ان کی زبان حد درجہ "محتاط" ہونی چاہیئے، کچھ اس طرح کہ وقار و تمکنت اور سنجیدگی و متانت آگے بڑھ کر ان کی بلائیں لینے لگیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قائدین کو آپس میں لڑانے میں دونوں طرف کے مفاد پرستوں اور سستی شہرت کے طالبوں کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے، بقول بہادر شاہ ظفر ؎

لڑے ہیں میکدہ میں آج جو یوں شیشہ و ساغر
کرشمہ چشمِ ساقی نے دکھایا کچھ نہ کچھ ہوگا

صبر اور اعتدال کی ضرورت

اس پر بھی نظر رہے کہ اختلاف کے موقع پر انسان کو اس قدر دور نہیں نکل جانا چاہیئے کہ کل اگر دوستی ہو تو آنکھ ملاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو، ایک انسان کو سوچنا چاہیئے کہ جس طرح وہ اپنے بارے میں دوسرے سے اچھی رائے رکھنے اور حُسنِ ظن سے کام لینے کی خواہش رکھتا ہے، دوسرا بھی اپنے بارے میں یہی چاہتا ہے، ساری لڑائی کی بنیاد یہ ہے کہ ہم دوسروں کے لئے "سیر" اور اپنے لئے "سوا سیر" چاہتے ہیں، آج عوام سے زیادہ قائدین میں اتحاد اور قوتِ برداشت کی ضرورت ہے، اہلِ حرم کے درمیان آپس میں جو ان دنوں ٹھنی ہوئی ہے اسے اگر کسی بتکدہ میں بیان کیا جائے تو علامہ اقبالؒ کے بقول "صنم بھی ہری ہری کہنے لگے"۔ بڑا لطف دے گا اگر اس موقع پر ان کا یہ پورا شعر پڑھ لیں ؎

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے،
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

یاد رکھیے! فولاد کی صلابت کی ضرورت رزمِ حق و باطل میں پیش آتی ہے۔ حلقۂ یاراں ہو تو اس وقت ریشم کی نرمی چاہیے، کاش کہ ہمارے قائدین آپس کے معاملات میں صبر و تحمل اور عفو و درگذر کی صفت کو مہمیز کرتے اور "لا نا غنچہ قلمندان" کے ایک تاریخی واقعہ کے پسِ منظر میں اپنے قلم اور زبان کو ہجو پر برانگیختہ نہ کرتے۔ پیغمبرِ انقلاب اور ہادیٔ اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام و بقا کی جد و جہد میں "صبر" کو "امیرالامراء" (کمانڈر انچیف) قرار دیا ہے کہ اس کی سرکردگی میں میدان فتح ہوتا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

"علم کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو، کیوں کہ علم مؤمن کا دوست ہے، حلم (بردباری) اس کا وزیر ہے، عقل اس کی رہبر ہے، نرم خوئی اس کا بھائی ہے اور صبر اس کے لشکر کا کمانڈر انچیف ہے۔"

حضرت علیؓ نے ایک موقع پر "صبر" کے نفسیاتی پہلو کو اس طرح بیان کیا ہے:

"جس طرح انسان کے بدن سے سر کا تعلق ہے، اسی طرح جسمِ ایمانی سے صبر کا تعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سر کے جدا ہونے کے بعد جسم بے کار اور بدبودار ہو جاتا ہے، جسے صبر نہیں اسے ایمان کا مقام حاصل نہیں ہے۔"

حضرت علیؓ نے تشبیہ میں "انتن" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے اور صبر نہ ہونے کی صورت میں "جراثیم" کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پوری سماجی زندگی

متعفن اور بدبودار ہو جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کے قول کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول بھی پیشِ نظر رکھیے :۔

"جو شخص تم پر غصہ کا اظہار کرے تم اس کے مقابلہ میں صبر سے کام لو، جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آئے تم اس کے ساتھ حلم و بردباری کا معاملہ کرو اور جس نے تمہیں ستایا، اس کو معاف کر دو۔"

بعض روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی شخص نے گالی دی یا بُرا کہا تو آپؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

"اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم و خطاوار اور بُرا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دے اور اگر تم نے جھوٹ کہا ہے تو اللہ تمہیں معاف فرما دے۔"

حاصل یہ کہ قائد کے کردار کی اصل اور بنیاد صبر و تحمل، عفو و درگذر، محتاط زبان اور تلخیوں اور رنجشوں کو بھلا دینا ہے اسی "شاہ کلید" سے اتحاد و اتفاق اور تمام نیکیوں اور بھلائیوں کے دروازے کھلتے ہیں اور مراد و مطلب کی کھیتی ہری بھری ہوتی ہے۔ ہر شعبۂ حیات (تعلیمی، معاشی، اصلاحی، روحانی، سیاسی وغیرہ) کے قائد اور اس کی پیروی کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ اس "راز" کو سمجھیں اور کیفؔ بھوپالی کے اس پُرکیف شعر سے اپنے ذہن و دماغ کو باکیف بنائیں کہ ؎

چار دن کی ہے یہ دنیا تو ضروری ہے میاں
ایک انسان سے انسان ٹھکانے سے ملے

تعمیری تنقید اور جواہر لال نہرو

"نیشنل ہیرالڈ" ہمارے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے اور اکثر ہم پر سخت تنقید کرتا ہے"

یہ شکایت ایک بار لکھنؤ میں بعض کانگریسی قائدین نے آنجہانی جواہرلال نہرو (۱۹۶۴ - ۱۸۸۹ء) سے کی، چونکہ نیشنل ہیرالڈ (جاری شدہ ۱۹۳۸ء) کانگریس کا اخبار تھا اور نہرو جی اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیرمین تھے اس لئے شکایت کرنے والے چاہتے تھے کہ نہرو اخبار کے ایڈیٹر کو پابند کریں کہ وہ کانگریس پر تنقید نہ کریں اور ہر حال میں یہ اخبار ہماری تیج کرتا رہے۔ نہرو اولاً خاموش رہے، اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جب شکایت کرنے والوں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو واقعہ نگار کے الفاظ میں" وہ غصے سے پھٹ پڑے" اس حالت میں ان کی زبان پر جو الفاظ آئے وہ یہ تھے :

"آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں ایڈیٹر سے کہہ دوں کہ وہ ہمیشہ ہماری تعریف کرتے رہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ آپ کا ایڈیٹر چیلاپتی راؤ ایک لائق آدمی ہے اور اس کی ایمانداری کے بارے میں

دو رائیں نہیں ہوسکتیں ؟ ایسا ایڈیٹر رکھنے سے کیا فائدہ جو خض خوشامدی ہو۔"

سبق آموز انداز

اس واقعہ کو اپنے انداز اور الفاظ میں نہرو کے قریبی رفیق اور نیاز مند پی. ڈی ٹنڈن نے اپنی کتاب "نہرو ـــــ ایک انسان" میں بیان کیا ہے، جس کا اُردو ترجمہ جناب نورالحسن نقوی نے "نہرو کے اَن دیکھے روپ" کے نام سے کیا ہے۔ پی، ڈی ٹنڈن نے اس واقعہ کے آخر میں لکھا ہے :-

"جو لوگ شکایت کر رہے تھے ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اخبار کے سلسلہ میں نہرو کا یہ رویہ تھا۔ اسی نے اخبار کو یہ شان دی اور اخبار نویسی کی دنیا میں "نیشنل ہیرالڈ" کو وہ جگہ ملی جو کم اخباروں کو ملتی ہے۔ شاید یہ اکیلا اخبار تھا جس کے مینجنگ ڈائرکٹر ایڈیٹر کے کام میں دخل دینے سے بچتے تھے۔" (نہرو کے اَن دیکھے روپ صـ۱۳۶)

پی، ڈی ٹنڈن نے اس سلسلے میں کچھ اور لکھا ہے، جس سے نہرو جی کی مزاجی کیفیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"نہرو جب کسی پر بھروسہ کرتے تھے تو اس کے کام میں دخل نہ دیتے اور کبھی اس کی ایمانداری پر شک نہ کرتے تھے، وہ ہمیشہ "نیشنل ہیرالڈ" کو یہ صلاح دیا کرتے تھے کہ ہمیشہ نڈر ہو کر کڑی نکتہ چینی کرنی چاہیے، اگر ایڈیٹر

کانگریس کے کام اور اس کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتا تو نہرو جی اس کا بُرا نہ مانتے تھے، حالانکہ یہ اخبار کانگریس ہی کا تھا وہ بار بار کہا کرتے تھے کہ "جب تمہیں لکھنا ہو تو ڈر کے کبھی نہ لکھو"۔ نیشنل ہیرالڈ پر بڑی ذمہ داری ہے۔ اسے قوم کی رائے بنانے کے لئے بہت بڑا کام کرنا ہے، بزدلی چھوت کی بیماری ہے، اگر تمہیں قوم کو راستہ دکھانا ہے تو بہادر بنو، پھر سب تمہارے پیچھے چل پڑیں گے، اگر تم ہچکچاؤ گے تو لوگوں کے قدم ڈگمگانے لگیں گے اور بہت سے تو لڑکھڑا کے گر پڑیں گے"۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۵)

عالی ظرف انسان کی شان

آنجہانی جواہرلال نہرو کے بعض آرار، خیالات اور نظریات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شریف اور بڑے انسان تھے۔ پی، ڈی ٹنڈن نے ان کے بارے میں یہ جو باتیں بیان کی ہیں ان کے شریف اور بڑے ہونے کا پختہ ثبوت ہیں، انکی ان باتوں سے یہ حقیقت تو بالکل واضح ہو کر سامنے آرہی ہے کہ وہ صحافت میں آزادی کے خواہاں تھے مگر ایسی آزادی جو تعمیری رجحانات کی حامل اور ایماندارانہ اصولوں کی پابند ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک صحافی اور صاحبِ قلم جو عوامی ذہن بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے اس کا ضمیر بیدار، نیت پاک اور ایک دائرے اور حدود میں رہتے ہوئے قلم بیباک ہو۔ اس کے ساتھ ان کی باتوں سے یہ پیغام بھی مل رہا ہے کہ وسیع

النظر اور عالی ظرف انسان ہمیشہ اپنے خلاف کی ہوئی تنقیدوں کو سنتا ہے اور اس کے صحت منداجزار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اصلاحِ حال کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صرف اپنی تعریف سننے ہی کا مشتاق نہیں رہتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ یہ ایک ایسی خواب آور گولی ہے جو اکثر فعال اور کارکرد آدمی کو بھی غفلت کے بستر پر سُلا دیتی ہے، تعمیری اور اصلاحی تنقید کی مثال عمل جراحی کی سی ہے کہ اس کے ذریعہ فاسد مادہ نکال کر صالح خون پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ایک فلسفی کا قول ہے کہ

> " دنیا میں صحیح تنقید کرنے والوں کی کمی ہے اور ان سے بھی زیادہ کمی ان لوگوں کی ہے جو صحیح تنقید سننے کا حوصلہ رکھتے ہوں "

چاپلوس اور خوشامدی ہم نشینوں سے بچئے

نہرو جی کی مذکورہ باتوں سے یہ بھی معلوم ہورہا ہے کہ باحوصلہ اور عالی ظرف انسان اگر کسی جماعت یا ادارہ کا سربراہ ہوتا ہے تو وہ اپنے ماتحتوں کو خواہ مخواہ کے لئے ڈرا دھمکا کر دباؤ میں نہیں رکھتا بلکہ انہیں اظہارِ خیال کی کھلی آزادی دیتا ہے، وہ باہمی اعتماد اور خلوص و محبت کے لئے فضار اور ماحول کو سازگار بناتا ہے۔ وہ اپنی بلند نظری کے سبب لائق اور مخلص صحافیوں کے مقام اور رتبہ سے واقف ہوتا ہے اور ان کی رائے، مشورے، تبصرے، تجزیے ہر ایک کو لائقِ التفات سمجھ کر کارآمد باتوں کو چُن لیتا اور اس سے اپنے فکر و عمل کے چراغ کی لَو کو

تیز کرتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے عہدے اور منصب پر فائز ہوتے ہوئے بڑی باریک بینی کے ساتھ اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ اس کے گرد کہیں چاپلوس اور خوشامدی تو نہیں جمع ہو رہے ہیں جو مفاداتِ حاصلہ اور اغراضِ فاسدہ کے تحت اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اور اس کے سامنے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کے لئے چاہ کنی کر رہا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے فرماں رواؤں اور بادشاہوں کے عروج و زوال کی تاریخ پڑھ جائیے تو معلوم ہو گا کہ انہیں دھکا ہمیشہ خوشامد پرست ہم نشینوں اور مصاحبوں سے پہونچا ہے اور انہوں نے ہی زوال کے دہانے تک انہیں پہونچایا ہے۔ ایسے خوشامدی مصاحبوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ بقول شیخ سعدی شیرازیؒ "اگر بادشاہ عین دوپہر کے وقت یہ کہے کہ آسمان پر چاند نکلا ہوا ہے تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہیں گے کہ جی ہاں، تارے بھی چھٹکے ہوئے نظر آرہے ہیں"

یہ بات دانائی کی ہے

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اہلِ رائے، صاحب بصیرت، دوراندیش اور زمانہ شناس لوگ ہر دور میں کم مگر اپنی جگہ بہت اہم رہے ہیں ایسے لوگ اگر کھل کر مناسب لب و لہجہ میں کوئی تنقید کریں، کوئی رائے اور مشورہ دیں تو اصحابِ اقتدار و اختیار اور عام آدمی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نہرو جی جیسا باحوصلہ دل اور کشادہ نظر پیدا کریں اور ان کی باتوں کو لائقِ اعتناء سمجھیں، ترقی کا یہ بہترین زینہ ہے اور اس راز کو نہرو جی پا گئے تھے، کسی حکیم کا قول ہے کہ

"عاقل اور دانا کا فرض ہے کہ اپنی رائے کے ساتھ دوسرے عقلاء کی رایوں کو بھی ملائے اور اپنی عقل کے ساتھ حکماء کی عقلوں کو بھی جمع کرے، کیوں کہ تنہا رائے بسا اوقات لغزش کھا جاتی ہے اور تنہا عقل بسا اوقات گمراہ ہو جاتی ہے اور تعمیری اور اصلاحی تنقید صحیح رُخ اور صحیح سمت عطا کرتی ہے۔"

غلطی کا اعتراف

آغا! ریش می تراشی ؟ (جناب! آپ داڑھی تراشتے ہیں؟)
جب ایران کے سفیر کی ملاقات دہلی میں فارسی کے مشہور شاعر مرزا بیدل سے ہوئی تو اس نے حیرت کے ساتھ یہ چبھتا ہوا سوال کیا۔ اس سوال کا پس منظر یہ تھا کہ مرزا بیدل کا کلام ایران تک پہنچا تھا اور اس میں صوفیانہ مضامین دیکھ کر لوگ بیدل کو قطب سمجھنے لگے تھے، ایسے کسی بھی قطب کی وضع قطع کا..... جو عام معیار ہونا چاہیے تھا اس پر بیدل پورے نہیں اتر رہے تھے کیونکہ وہ داڑھی تراشتے تھے جس کی وجہ سے ان کی داڑھی خشخشی تھی۔

وہ تین دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے

مرزا بیدل نہایت ذہین اور حاضر جواب تھے، اس سوال پر وہ فوراً بولے "ریش می تراشم ولے دلِ کسے نمی تراشم" (جی ہاں! میں اپنی داڑھی تو ضرور تراشتا ہوں لیکن کسی کا دِل نہیں چھیلتا) بظاہر یہ خاموش کر دینے والا جواب تھا مگر سفیر ایران بھی کافی پڑھا تھا اور ذہین تھا

اس نے جواب دیا "بلے" دلِ رسول اللہ می تراشی" (ہاں مگر آپ اپنے اس عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل ضرور چھیلتے ہیں) ———

مرزا بیدل اپنی ذہانت اور شاعرانہ جودتِ طبع سے اب بھی کوئی جواب تلاش کر سکتے تھے مگر یہ سنتے ہی وہ خاموش ہو گئے اور غلطی کے احساس سے سر نیچا کر لیا۔ اس کے بعد گھر گئے تو اس جملہ کا اثر اتنا تھا کہ تین دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔

واقعہ ہے کہ جو لوگ صحیح سوچ و فکر کے عادی ہوتے ہیں اور "حقیقت پسندی" ان کی طبیعت اور مزاج میں داخل ہوتی ہے وہ اس طرح صحیح اور تعمیری تنقید سن کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے موقع پر خواہ مخواہ قیل و قال اور بحث و مباحثہ میں پڑنے کے بجائے اپنی غلطی کو محسوس کر کے نادم و شرمندہ ہوتے ہیں اور اصلاح کی فکر کرتے ہیں۔

ایک جائزہ

ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر سطح پر سیکڑوں برائیاں، کمزوریاں اور بدعنوانیاں ملتی ہیں جو ہماری زندگی کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں لیکن انجام سے بے خبر ہم اپنی ظاہری حالت میں مست و مگن ہیں، کوئی توجہ دلائے، صحیح صورتِ حال سامنے رکھے حق کو حق اور باطل کو باطل کہے تو بجائے غور و فکر کرنے کے ہم بدکتے ہیں، ناک بھوؤں چڑھاتے ہیں اور ایسے شخص کو بجائے اس کے کہ ہم ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کریں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اس وقت ہماری زبان بے وزن، بے دلیل اور بے سر و پا باتوں سے تھکتی نہیں، اس کے باوجود

خدا کے کچھ بندے تعمیری نقد و احتساب سے باز نہیں آتے، ایسے موقع پر ان کا یہ جذبہ ہوتا ہے ؎

اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

حضرت امام غزالیؒ کا قول ہے کہ

" فی الحقیقت وہ میرا دوست نہیں جو میرے منہ پہ میری تعریف کرے بلکہ دوست وہ ہے جو میرے سامنے میری برائی بیان کرے اور اصلاحی اور تعمیری تنقید کرکے مجھے اپنی زندگی کو بنانے اور سوارنے کا موقع فراہم کرے "

ایک مشت داڑھی سنت ہے۔ اس ترک سنت پر سفیرِ ایران نے جس بلیغ مگر چبھتے انداز میں بیدلؔ کو تنبیہ کی وہ تو قابلِ توجہ ہے ہی مگر بیدلؔ نے صحیح تنقید اور معقول بات سن کر باوجودیکہ وہ بات کاٹنے اور بڑھانے کے میدان کے شہسوار تھے خاموشی اختیار کر گئے، اصلاحِ حال کی طرف توجہ کی اور اس کا احساس اس قدر شدید ہوا کہ تین روز تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ بلاشبہ انسانوں سے آباد دنیا میں ایسے انسان بہت کم نظر آتے ہیں، اس لئے توجگرؔ نے کہا ہے ؎

جہلِ خرد نے یہ دن دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

کارِ زمانہ جتنا جتنا،
بنتا جائے بگڑتا جائے

قابلِ توجہ پہلو

اس واقعہ کا ایک اور پہلو قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ بقول ایک فلسفی "اس دنیا میں صحیح تنقید سننے والوں کی بہت کمی ہے لیکن اس سے زیادہ کمی صحیح تنقید کرنے والوں کی ہے"۔ اگر ہم اپنے ماحول و معاشرے پر نظر ڈالیں تو اس قول کی صداقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ ہمارے اکثر ناقدین ایسے ہیں کہ جن پر وہ تنقید کرتے ہیں اور ان کے خلاف ان کے دل میں کسی وجہ اور سبب سے انتقام و عداوت کی آگ سُلگ رہی ہوتی ہے، یہ چنگاری رفتہ رفتہ شعلہ میں تبدیل ہو جاتی ہے پھر موقع پاکر اس "عالَم" میں جو کچھ لکھتے اور بولتے ہیں وہ در اصل کوئی تنقید نہیں بلکہ وہ "اندرونی بوکھلاہٹ" کا اظہار ہوتا ہے، زبان و بیان کی ناشائستگی اور موقع و محل کی عدمِ رعایت تو بس "کریلا نیم چڑھا" کا کام کرتی ہے۔ ایسی تنقیدوں سے کبھی بھی مفید اور خوشگوار اثرات مرتب نہیں ہو سکتے سوائے اس کے کہ جن پر تنقیدیں کی جا رہی ہیں ان کے غم و غصہ کو ابھارا جائے اور ملّت میں غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا جال بچھا کر اسے نت نئی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں مبتلا کیا جائے۔ اپنی "انا" اور اُبلتے ہوئے جذبے کی تسکین کا یہ طریقہ کسی طرح ٹھیک اور معقول نہیں۔ صالح معاشرہ میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دیر یا سویر انہیں آخر بدلہ مل کر رہتا ہے۔

یاد رکھئے، صحیح تنقید، معتدل اور متوازن لب و لہجہ میں اخلاص اور جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ جو کی جاتی ہے وہ یقیناً اپنا اثر رکھتی ہے، اسی طرح غلطی کے احساس اور اعتراف میں انسان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

◯◯

...... اور اقبالؔ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں

ارباب دین و دانش، اصحاب علم و تحقیق اور اہلِ شعر و ادب میں جو لوگ علامہ اقبالؔ (۱۹۳۸ء ـ ۱۸۷۳ء، بحوالہ تذکرۂ ماہ و سال) سے قریب تر رہے ہیں، ان میں ایک اہم نام حکیم احمد شجاع (۱۹۶۵ء ـ ۱۸۹۵) کا بھی ہے، حکیم احمد شجاع نے عِلمی استفادہ علی گڑھ سے کیا تھا، یہ افسانہ نگار بھی تھے، انشاء پرداز بھی اور شاعر بھی، لیکن ان کو ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اتنی شہرت ملی کہ آج بھی ان کو ان کے ڈراموں ہی کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، تاہم ان کے شخصی حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی داخلی زندگی میں بہت زیادہ مذہبی تھے، انہوں نے بیس سال تک تفسیر کا مطالعہ کیا، ان کا ارادہ تھا کہ قرآن کی مکمل تفسیر لکھیں، ابھی پہلی ہی جلد لکھ سکے تھے کہ انتقال ہو گیا، اس طرح اپنی عمر کی آخری خواہش کی تکمیل نہیں کر سکے۔

حکیم احمد شجاع بچپن ہی سے اپنے والد کے ہمراہ علامہ اقبالؔ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ یہ آمد و رفت عمر کے ساتھ بڑھتی

اور پختہ ہوتی رہی۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال کے اشتراک سے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لئے جدید اُردو نصاب بھی تیار کئے تھے، اسی طرح جب حکیم صاحب نے رسالہ" ھزار داستان،، جاری کیا تو علامہ اقبال نے اس کے سرورق کے لئے ایک شعر اپنے قلم سے لکھ کر دیا تھا جو سالہا سال "ہزار داستان" کے سرورق پر شائع ہوتا رہا، شعر یہ ہے ؎

عشق نے کر دیا مجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے

حکیم صاحب کی علامہ اقبال سے روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ایک روز حکیم صاحب نے علامہ اقبال کو بہت زیادہ فکرمند، مغموم اور بے چین پایا، گھبرا کر دریافت کیا، خیریت تو ہے۔ آج آپ خلاف معمول بہت پریشان ہیں، فرمایا، اس خوف سے مضطرب ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے۔

یہ ہے حکیم احمد شجاع کا اجمالی تعارف اور علامہ اقبال سے ان کی گہری وابستگی اور والہانہ لگاؤ و تعلق کی نوعیت و کیفیت، اب اس کے بعد دوسرے پہلو کی طرف آئیے، جس کا تذکرہ حکیم احمد شجاع نے اپنے حالاتِ زندگی پر مشتمل دلچسپ کتاب "خون بہا،، (صفحات ۴۳۸-۴۴۱) میں کیا ہے اور اسی پہلو کا بیان فی الوقت راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے۔

" خون بہا،، کے مطالعہ سے واضح ہے کہ حکیم صاحب کو

ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کا بہت شوق تھا، چنانچہ انہوں نے ملازمت کے دوران بھوپال اور حیدرآباد کا بھی سفر کیا۔ یہاں کچھ عرصہ گذارنے کے بعد" پاک پٹن پہنچے، پاک پٹن میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، یہ لوگ تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ تھے، مکتبوں میں پڑھائی ہوتی تھی، کوئی ماڈرن اور جدید اسکول نہیں تھا، چنانچہ حکیم صاحب نے پاک پٹن میں "فریدیہ اسکول" قائم کیا اور سوچا کہ اسے سرسید احمد خاں کے طریقۂ کار کے مطابق چلائیں گے۔ اس سلسلہ میں انہیں علامہ اقبالؒ کے مشورے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ جب لاہور پہنچے تو ان کی خدمت میں نیازمندانہ اور مستفیدانہ حاضر ہوئے، پاک پٹن کے مسلمانوں کی زبوں حالی تفصیل سے بیان کی۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی باتیں غور سے سنیں، پھر آنکھیں بند کرکے کچھ سوچنے لگے۔ اس کے بعد جو کچھ فرمایا اسے وہی فرما سکتے تھے، عقل، تجربہ، فلسفہ، تاریخ اور دین ودانش، سب کا نچوڑ، حاصل اور خلاصہ۔ دل تھام کر دیدۂ تر کے ساتھ پڑھئے:۔

"جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی، میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب، ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی، ان

مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں
کے بچوں کو ان ہی مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملّا
اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ جو کچھ
ہو گا اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر
ہندوستان کے مسلمان مکتبوں کے اثر سے محروم
ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں
مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود
آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر، الحمرا اور بابُ
الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی
تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان
میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلّی کے لال قلعہ
کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سال کی حکومت اور
ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

حکیم احمد شجاع کا بیان ہے کہ یہ کہتے وقت اقبالؔ کی
آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، وہ فضا کی وسعتوں میں کچھ
دیکھنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں ہمیں
نظر نہیں آتا، پھر اسی طرح فضا میں نظریں گاڑے اپنی سوز و
گداز میں ڈوبی ہوئی لے میں جو ان کے آنسوؤں کے رکے ہوئے
طوفانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، یہ
اشعار پڑھنے لگے:- کل ایک شوریدہ بارگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملّت مٹا رہے ہیں

غضب ہیں یہ "رہبرانِ خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
مسافرانِ رہِ حرم کو رہِ کلیسا دکھا رہے ہیں

حکیم احمد شجاع نے یہ قطعہ اسی طرح لکھا ہے، جب کہ "کلیاتِ اقبال" (شائع کردہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی) میں یہ قطعہ چار بندوں پر مشتمل اس طرح ہے:

کل ایک شوریدہ خوابگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملّت مٹا رہے ہیں
یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں
غضب ہیں یہ "مرشدانِ خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو اپنی عزّت بنا رہے ہیں
سُنے گا اقبالؔ کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

حکیم احمد شجاع قطعہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس مردِ کامل کے جذب اور شدتِ احساس کی یہ کیفیت تھی کہ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے اور میں اپنی ذمہ داری کے احساس سے کانپ اٹھا، اقبالؔ نے میری یہ کیفیت دیکھی تو فرمانے لگے:

"تمہاری فطرت میں ایک جوہر ہے جو ابھی تربیت کا محتاج ہے، تمہارے جوش کی شراب ابھی ناپختہ ہے، اسے ذرا سی دیر اور یہیں رہنے دو، کچھ دن میرے پاس اگر رہو تو میں تمہیں ان باتوں

کو ٹھلانا سکھا دوں گا جو تم نے کتابوں میں پڑھی ہیں
میں مدت سے ایک دیوانے کی تلاش میں ہوں۔
شاید تمہارا جنون میری فطرت کے رموز سے آگاہ ہو جائے"

یہ ہیں اقبال، ان کی فکرمندی اور دردمندی وسعت نظری اور ژرف نگاہی، فراست ایمانی اور تجزیہ نگاری، دل کا سوز و گداز اور اخلاص و یقین، پختہ عمری میں پختہ خیالی کی دل آویز تصویر۔

آپ ہی سوچیئے، ہندوستان میں دینی مدارس و مکاتیب کی جو اہمیت و افادیت، نافعیت اور معنویت ہے اس پر روشنی بڑے سے بڑے مضمون اور بڑی سے بڑی کتاب میں اس خوبی اور کمال کے ساتھ ڈالی جا سکتی ہے، پھر کیا ہے کہ جو چیز اب "بدیہی" ہے اسے "نظری" بناتے ہوئے بحث و مباحثہ کا نیا دروازہ کھولا جائے۔ طرفہ تماشہ تو یہ کہ بعض ایسے فضلاء اور نوجوان جنکی "حیثیتِ عرفی" کا خمیر مکتب و مدرسہ ہی سے اٹھا ہے، وہ بھی علامہ اقبالؔ کی "فکر بسیط" کا مطالعہ کیئے بغیر، ان کے بعض اصلاحی اشعار جو وقتی جذبہ اور کسی "غلبۂ حال" (نہ کہ دوامی تاثر) کے تحت کہے ہوئے ہیں، تجزیاتی شعور سے ان کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے ان مکتبوں کی "تنقیص" میں بے جا استعمال کرتے ہیں، جب کہ ایک ہی مسئلہ میں دو طرح کی رایوں کے وقت شاعر اور مصنف کے منشا و مراد کو پانے کے لئے تحلیل و تجزیہ، ذہنی پسِ منظر، اصلی مزاج و طبیعت اور نفسیاتی کیفیت کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنا پڑتا ہے، رایوں کی زمانی حیثیت کا خیال کرتے ہوئے "قولِ قدیم" اور "قولِ جدید" کی بھی اصطلاح

ایسے موقعہ کے لئے رائج ہے، نیز جو لوگ دینی مکاتب و مدارس اور افراد و اشخاص کے بارے میں پہلے ہی سے "بیمار ذہنیت" کے حامل ہیں، انہیں ایسے آزادانہ اور غیر محتاط تبصرے سے تقویت پہنچتی ہے۔

اس لئے راقم الحروف کے خیال میں امت اور ملت کے بڑے مفاد کی خاطر کسی ایسی جھوٹی بات کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیئے جس سے عمومی طور پر دینی اشخاص و افراد اور دینی اداروں سے نفرت کا جذبہ اُبھرتا ہو، اسلام میں اصلاحِ حال کے لئے پورا فلسفہ اور نظریہ موجود ہے، اگر کسی دینی ادارہ میں فی الحقیقت کوئی بات ہو بھی تو ذاتی اور شخصی حملے کی بجائے حکمت و موعظت سے کہی ہوئی بات زیادہ مؤثر، مفید اور نفع بخش ہوتی ہے، چہ جائیکہ گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگنے کی کوئی صورت سامنے آئے اور انجام کار اقبالؔ کا یہ مصرعہ صادق آئے کہ ؏

مسافرانِ رہِ حرم کو، رہِ کلیسا دکھا رہے ہیں

عصری تعلیم اور عصری اداروں کی اہمیت اپنی جگہ تسلیم شدہ حقیقت ہے، تاریخی حیثیت سے علی گڑھ، عثمانیہ اور جامعہ ملیہ کا قیام دراصل اسی تسلیم شدہ حقیقت کے عملی مظاہر ہیں، تاہم دیوبند مظاہر علوم، ندوہ، جامعہ نظامیہ اور دیگر دینی مدارس کی دینی اور ملّی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اس سے انکار تو دین سے ناآشنائی اور ملت سے بے ربطی کی علامت ہوگی، جب کہ ان دونوں معاملات میں حال یہ ہونا چاہیئے کہ :-

ؔملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ ∴ پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے اور سوسائٹی میں بہت سارے حکیم احمد شجاع جیسے جوان ہیں، جنہیں اقبال جیسے " دانائے روزگار" (جس کی مثال سے کوئی دور اور زمانہ خالی نہیں رہے گا) سے ربط و تعلق کی ضرورت ہے، یہی وہ ربط و تعلق یا دوسرے لفظوں میں بڑے اور بزرگوں کی صحبت و معیّت اور ان سے مشورے کی برکت کا اثر ہوگا جس سے ایسے جوان "خام خیالی" سے "پختہ خیالی" کی سمت سفر کر سکتے ہیں، جذبات کے بہاؤ سے حقائق کے ٹھہراؤ کی طرف آ سکتے ہیں کورس کے لفظی گورکھ دھندوں سے نکل کر معانی کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں" کرامتِ مکتب" پر نظر رکھتے ہوئے" فیضانِ نظر" کی اہمیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ایسے ہی جوانوں کی جوانی کے جنون سے اقبال حق شناس پُر امید ہیں کہ وہ فطرت کے رموز سے آگاہ ہوگا اور ہندوستان کے حالات کے تناظر میں دینی مکاتب و مدارس کے تئیں باچشم نم، لرزتے ہونٹوں کے ساتھ، دل میں سُرورِ عشق اور چہرے پر یقین کا نور لیے ہوئے ان کے ہی اس نغمہ کو فضا میں بکھیرتا جائے گا کہ:

ؔہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ایک قومی مرض
اور
اس کا علاج

"تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر رہے": یہ جملہ علامہ اقبالؒ سے ان کے بعض ہم عصروں نے طنز و مزاح کے لب و لہجہ میں کہا۔ اس جملہ کا پسِ منظر یہ تھا کہ علامہ اقبال (۱۹۳۸ — ۱۸۷۷ء) کے بارے میں ان کے ان معاصرین کا یہ احساس تھا کہ یہ محض "فکری آدمی" ہیں۔ "عملی آدمی" نہیں ہیں۔ مزا تو جب ہے یہ خود بھی ملی، ملکی اور قومی مسائل میں عملی جد و جہد کریں، وطن کی آزادی میں ہماری طرح عملاً بھرپور حصہ لیں اور اس راہ کی مشکلات اور قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کریں۔ یہ تو اپنے بلند خیالات، اعلیٰ نظریات اور الفاظ و انداز کی بے پناہ قوت اور تاثیر سے ہمارے جسم میں عمل کی آگ لگا رہے ہیں اور خود جمود و تعطل کے شکار ہیں اور اپنی "فکری جنت" بسائے اسی میں گم اور مست و مگن ہیں۔

تقسیمِ عمل کا فلسفہ

جب ایک ملاقات میں ان کے ایک قابلِ قدر ہمعصر مولانا

محمد علی جوہر مرحوم (۱۹۳۱ - ۱۸۷۸ء) نے علامہ اقبالؒ سے اسی قسم کا سوال کیا تو انہوں نے ایک جواب دیا۔ جواب کا انداز تو نہایت ظریفانہ ہے لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بڑی حکیمانہ ہے۔

علامہ اقبالؒ نے کہا "سنو بھائی! تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے شور مچاتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے ہیں لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں؟" (آثار اقبال ص ۲۸)

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس جواب کے ذریعہ اصل میں یہ بتانا چاہا کہ جس طرح فطرت میں تقسیم عمل ہے اسی طرح افراد میں بھی تقسیم عمل ہے، ہر شخص کو چاہیے کہ اس کے مناسب حال جو عمل ہے اس کے لئے جدوجہد کرے، جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اپنی ذاتی صلاحیتوں کا پورا اندازہ لگا چکا ہوں، جس سے اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ میں خارجی طور پر کاروباری یا عملی زندگی کے مقابلے میں داخلی حیثیت سے فکری اور تاثراتی کارناموں کے لئے زیادہ موزوں ہوں۔ یہی دراصل میرا دائرۂ عمل ہے۔ اس سے گھسیٹ کر کسی دوسرے طرف لے جانے کا مطلب میری صلاحیتوں کا گھلا گھونٹنا ہے۔ اگر ایک شخص کو اس کی صلاحیت اور استعداد کے لحاظ سے کام کا موقع فراہم کیا جائے تو وہ شخص اپنے اس من پسند میدانِ عمل میں زیادہ بہتر طور پر کام

انجام دے سکتا ہے۔ اس مخصوص میدان میں اس کی صلاحیت کا جوہر کھلے گا۔ اس کی شخصیت نکھرے گی اور اس کے فکر و فن کے جلتے ہوئے چراغ سے وہ لوگ روشنی حاصل کریں گے جو اس قسم کے چراغ جلانے سے محروم ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب بلوچوں کے ایک وفد نے ان سے ان کی بےعملی کی شکایت کی تو فرمایا "کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے اور تمہارے سامنے عمل کی شاہراہ پیش کر دی ہے"۔

علامہ اقبالؒ سے متعلق یہ باتیں اس حقیقت کو اُجاگر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ہر شخص ہر قسم کے کام کا اہل نہیں ہوتا بلکہ مختلف آدمی مختلف صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور انہیں صلاحیتوں کے مطابق وہ کسی خاص شعبۂ حیات میں کوئی کارنامہ انجام دیتے ہیں، جس طرح علامہ اقبالؒ غور و فکر اور شعر و سخن کے لئے موزوں ترین شخص تھے اور اس میدان میں وہ اپنے ایسے نقوش چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ اس کے خلاف وہ اپنے لئے کوئی میدان تلاش کرتے یا ان کے رفقاء انہیں ایسے کسی میدان میں کھینچ کر لاتے تو دنیا اس اقبالؒ سے واقف نہیں ہوتی جس کی اقبالمندی اور شہرت و عظمت ہماری قومی اور ملی تاریخ کا ورثہ ہے۔

ایک کمزوری

آج کے قومی امراض میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ جس شخص میں

قیادت ورہنمائی کی تھوڑی سی بھی صلاحیت دیکھی گئی تو لوگ اس سے ہر قسم کی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ یعنی چاہتے ہیں کہ جو شخص شاعر ہے وہی لیڈر بھی ہو۔ وہی صوفی بھی ہو۔ وہی عالم بھی ہو اور وہی سپاہی بھی ہو۔ اسی طرح جس شخص کی طبیعت خلوت میں بیٹھ کر قلم کے ذریعہ خدمت سے مانوس ہو، اسے چاہتے ہیں کہ جلوت، انجمن اور اسٹیج کا آدمی بنا دیا جائے۔ گویا فکری، علمی اور قلمی وصحافتی سطح پر جو کام کیا جائے وہ "عمل" کے دائرہ میں نہیں آتا اور گھر سے باہر قومی اور ملّی بنیادوں پر جو بھاگ دوڑ ہو وہی دراصل "عمل" ہے۔

عوامی سطح پر پیدا ہونے والی یہی وہ ذہنیت ہے جس سے ایک انسان اسی کام کی اہمیت کو سمجھتا ہے جس سے وہ منسلک ہے، دوسرے کاموں کو وہ قطعاً قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ شدہ شدہ یہ ذہنیت اس مرحلہ پر آجاتی ہے کہ اپنے کام کے بارے میں "یہ بھی صحیح ہے" کے بجائے "یہی صحیح ہے" کا تصور اُبھر آتا ہے، نتیجتاً اس ذہنیت کے بطن سے طرح طرح کی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ مختلف محاذ پر قومی اور ملّی کام کرنیوالے ایک دوسرے کے "رفیق" بننے کے بجائے "فریق" بن جاتے ہیں آپسی احترام رخصت ہو جاتا ہے، باہمی اعتماد باقی نہیں رہتا، خلوص ومحبت کی فضا دھندلی ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے کام میں کیڑے نکالنا، باہم کمزوریوں کی ٹوہ میں لگے رہنا شب وروز کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔

خالقِ جہاں ہر چیز کی تخلیق کے بعد اس کے مناسبِ حال "عمل" کی صلاحیت پیدا فرما دیتے ہیں۔ بقولِ شاعر ؎

قسمت کیا قسامِ ازل نے جسے چاہا
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا
غم مجھ کو دیا جو سب سے مشکل نظر آیا

فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق کام سپرد کیا جائے۔

قرآنِ حکیم میں ایک جگہ حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی زبانی یہ ارشاد فرمایا گیا کہ "رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی" (ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی) (طٰہٰ آیت ۵۰)

ایک مفسر قرآن کے الفاظ میں اس آیت کا مطلب یہ ہے "پروردگارِ عالم وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کی استعداد اور صلاحیت کے مناسب شکل و صورت عطا فرمائی اور معنوی قوتیں اور خاصیتیں بخشیں، پھر اس کی زندگی اور بقار کے لئے جن جن خارجی سامانوں کی ضرورت تھی وہ سب اس کے اطراف مہیا کئے اور اس کو اپنی معنوی قوتوں اور خارجی سامانوں سے کام لینے کی راہ سمجھائی۔ انسان کے مرتبہ کے لحاظ سے اس کے اندر عقل کا چراغ روشن کیا جس سے وہ پروردگارِ عالم کے وجود کو تسلیم کرسکتا ہے۔ پھر عقل کی رہنمائی کے لئے وحی نازل فرمائی، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت ہے کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ (ہر انسان اپنے طریقے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بنی اسرائیل آیت ۸۴) یہ آیت بھی پہلے بیان کردہ معنی و مفہوم کی تائید کرتی ہے۔

رہبرِ اعظم، معلمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کی فطری صلاحیتوں اور ان کے ذاتی رجحانات اور ذوق وشوق کا خیال رکھا ہے اور جو صحابی جس کام میں زیادہ مناسب نظر آئے آپؐ نے ان سے ویسا ہی کام لیا اور ان کے من پسند میدان میں ان کی پوری حوصلہ افزائی فرمائی ہے چنانچہ آپؐ کے صحابہ میں ایک طرف حضرت ابو ہریرہؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جیسے یکتائے روزگار اصحابِ علم وفضل ہیں تو حضرت حسان بن ثابتؓ اور کعب بن مالکؓ جیسے قادر الکلام شعراء بھی اور حضرت زید بن ثابت انصاریؓ جیسے کئی زبانوں کے ماہر بھی، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور ابو ایوب انصاریؓ جیسے تبلیغ دین کے جذبہ سے سرشار بھی، دوسری طرف حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ، خالد ابن الولیدؓ اور ابو عبیدہ ابنؓ ہیں جن کے نام کے بغیر قیادت وسیادت، انتظام وتدبیر، حزم ومصلحت اندیشی، آئین جہانبانی اور سرفروشی کی تاریخ نامکمل ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ بھی ہیں جو غزوۂ خندق کے موقعہ پر خندق کھودنے کی تدبیر بڑی فراست سے بتا رہے ہیں، اور حضرت عروہ بن مسعودؓ اور غیلان ابن اسلمؓ بھی ہیں جو دمشق کے مشہور صنعتی شہر میں اس لئے جاتے ہیں تاکہ بعض جنگی اسلحہ اور سامانوں کی صنعت سیکھیں ——— قدرت کو بھی یہی منظور ہے کہ صلاحیتوں اور رجحانات کا یہ اختلاف باقی رہے تاکہ کارخانۂ عالم کا ہر کام انجام پاتا رہے اسلئے آج کسی ایک فرد یا کسی ایک تنظیم وتحریک سے قوم وملت کی تمام ضرورتوں کو وابستہ کرنا جس طرح ناعاقبت اندیشی ہے اسی طرح خود کسی ایک فرد یا کسی ایک تنظیم وتحریک کا قوم وملت کے ہر گوشہ میں رہنمائی کا مدعی بننا بھی خود فریبی ہے

فرد اور جماعتوں کو اپنے اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرنا چاہیئے "ہر کارے ہر مردے" اور "ہر کسے را بہر کارے ساختند" کا مقولہ ایسے ہی موقعہ کیلئے ہے۔
اگر قوم اور ملت کے خدمت گذار اور عام لوگ اس فلسفہ کو سمجھ گئے تو اپنے دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے دوسروں کیلئے خیر سگالی کے جذبات رکھیں گے اور باہمی احترام کے ساتھ ایک دوسرے کیلئے دستِ تعاون بڑھائیں گے اور اپنی جماعت یا اپنے کام کے بارے میں "یہی صحیح" کے بجائے "یہ بھی صحیح" کا جذبہ پروان چڑھے گا اور دوسری جماعت اور دوسرے کے کاموں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کی فضا عام ہوگی۔

✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻

دانش ور اقبال کی دانش مندانہ باتیں

واقعات کے پس منظر میں

اقبال بڑا اُپدیشک ہے مَن باتوں میں موہ لیتا ہے

جس نے کہا سچ کہا کہ "بات ہر بات کو نہیں کہتے، بات مشکل سے بات ہوتی ہے" جب ایسی کوئی بات سامنے آتی ہے تو اس میں حکمت اور دانائی ہوتی ہے، گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے، بصیرت اور دوراندیشی ہوتی ہے، مطالعہ کی قوت ہوتی ہے، علم کا زور ہوتا ہے۔ دردمندی اور فکرمندی جھلکتی ہی نہیں، بلکہ چھلکتی ہے۔ وقار اور ٹھہراؤ ہوتا ہے' قرینہ اور سلیقہ ہوتا ہے، دل اور دماغ دونوں کو متوجہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے' اس قسم کی بات ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ اس کی مہک مشامِ جاں کو تازہ اور معطر رکھتی ہے، ماحول کو گرم کرتی ہے۔ جذبۂ عمل کو تحریک دیتی ہے۔

اس طرح کی (یعنی فکر انگیز اور معنیٰ خیز) بات کرنے کا جن لوگوں کو ڈھنگ آتا ہے دنیا انہیں عالم، حکیم، فلسفی اور دانش ور کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ علامہ اقبال کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ بڑے عالم، حکیم' فلسفی اور دانش ور تھے، خود اپنی فکر، خود اپنی نظر رکھتے تھے، رموز و حقائق سے پردہ اٹھانے کا فن جانتے تھے، معانی و معارف کی نہریں ان کی زبان اور قلم سے جاری رہتی تھیں' وہ اپنی باتوں سے حکمت و دانائی کے موتی بکھیرتے رہتے تھے، جو لوگ ان کو سنتے یا پڑھتے اپنے دماغ کو روشن پاتے اور دل میں سوز و گداز محسوس کرتے۔ اسی لئے خداشناس اور خود آشنا اقبال نے اپنے آپ کو "اُپدیشک" (ناصح، مشیر، واعظ، پندگو) کہا ہے'

ایسا اپدیشک" جو من باتوں میں موہ لیتا ہے۔ ان کے ایک مشہور شعر کا یہ مصرعہ ہے:

اقبال بڑا اپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے

من موہ لینے والے اقبال کی بعض من موہنی باتیں واقعات کے پس منظر کے ساتھ ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ باتیں اور حکایتیں فکر و نظر کو بنانے اور اخلاق و کردار سنوارنے میں اپنے اندر بڑی طاقت اور قوت رکھتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ علم و حکمت کے اعتبار سے اقبال کا قد بلاشبہ بڑا اونچا تھا۔ مذہب اسلام اور اس کے معتقدات پر ان کا پورا بھروسہ تھا، خدا کی عظمت اور نبیؐ کی محبت سے ان کا سینہ معمور تھا۔ ان کی نظر میں قرآن کی حقانیت اور اس کے پیغام کی صداقت ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی، معلم قرآن کی غیر معمولی عزت کرتے تھے، دل پاکیزہ جذبات اور حسین تخیلات کا مسکن تھا، انسانی مسائل سے دلچسپی اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی ان کی شناخت اور پہچان تھی، آپ علامہ اقبال کی اس حیثیت عرفی کو سامنے رکھئے پھر ایک ایک واقعہ کو پڑھتے جائیے اور مختلف جلوؤں کو نگاہ میں لیتے آئیے، سب سے پہلے خدا کی ہستی پر ان کی غیر متزلزل یقین اور حب نبویؐ سے سرشار عاشقانہ استدلال کا انداز دیکھئے:

فقیر سید نجم الدین بیان کرتے ہیں کہ علامہ مرحوم کی قیام گاہ پر چند احباب کی موجودگی میں ایک ملاقاتی یکایک یہ سوال کر بیٹھا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ عالم بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، کیا آپ خدا کی ہستی اور باری تعالیٰ کے وجود کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں؟ علامہ نے اس کے جواب میں کہا "نہیں" ملاقاتی نے اس پر مزید دریافت کیا، کہ جب یہ بات ہے تو پھر آپ کے نزدیک خدا کی حقیقت قابلِ تسلیم کیونکر ہوئی؟ علامہ نے فرمایا۔ یقیناً خدا کی ہستی ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس کے لئے مجھے کسی فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں، میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جن کے متعلق ان کے دشمن بھی کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جب فرمایا کہ

خدا مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے، تو خدا کی ہستی یقیناً ہے۔

اسی سلسلہ کا ایک دوسرا واقعہ جناب ممتاز حسن نے بیان کیا ہے، ان کے بموجب میں نے ایک دن علامہ اقبال سے کہا کہ آپ ایک دانش ور اور فلسفی ہیں اور نہ صرف یہ کہ قدیم و جدید فلسفوں سے اچھی طرح آگاہ و باخبر ہیں، بلکہ آپ اپنی جگہ خود بہت بڑے مفکر ہیں، مگر اس کے باوجود آپ اپنے اشعار اور مقالات میں خدا کا ذکر غیر فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے۔ امانول کانٹ کے فلسفیانہ افکار کی روشنی میں اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محض عقل و فلسفہ کی رو سے نہ تو خدا کے وجود کا اثبات ممکن ہے اور نہ اس کی تردید اور خدا کے بارے میں جب بھی فلسفے کی رو سے گفتگو ہو گی تو لازمی طور پر ہم وہی کہیں گے جو کانٹ نے کہا ہے، حیرت ہے کہ آپ اتنے بڑے مفکر اور فلسفی ہیں، پھر آپ کے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کے وجود پر عقلی دلیل لانے کے بجائے، خوش اعتقادی کے ساتھ اس کا ذکر کریں۔

ممتاز حسن کا بیان ہے کہ علامہ اقبال بڑی خاموشی اور ہمدردی سے میرے خیالات سنتے رہے، انہوں نے درمیان میں ٹوکا اور نہ ہی تعجب کا اظہار کیا، جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو فرمایا: خدا کے متعلق پوچھتے ہو، میں نے اسے دیکھا ہے؟ پھر زیر لب مسکرائے اور تھوڑے سے توقف کے بعد مزید فرمایا: انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں، جب وہ خدا کو دیکھ سکتا ہے، لیکن یہ لمحے کم ہی نصیب ہوتے ہیں" اور مزید فرمایا: "وہ بہت ہی کم"۔ ممتاز حسن نے دریافت کیا، کیا ہر شخص کے لئے خدا کا مشاہدہ ممکن ہے؟ علامہ اقبال نے فرمایا: "یہ دروازہ کسی پر بند نہیں ہے، لیکن جو شخص مشاہدے کا طالب ہو اسے صبر اور انتظار لازم ہے۔

یہ بات تو خدا کی ہستی اور اس کے وجود کے بارے میں تھی، جہاں تک تعلق "توکل علی اللہ" کا ہے تو اس سلسلہ میں فقیر سید وحید الدین نے لکھا ہے کہ ———— علامہ

اقبال کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس قدر بھروسہ اور توکل تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں متردد اور پریشان نہ ہوتے تھے۔ ان کے اندر راضی برضا رہنے کی سچ مچ کیفیت پیدا ہوگئی تھی، قناعت کے ساتھ خودداری اور صبر کے ساتھ توکل، یہ ان کے کردار کا نمایاں پہلو تھا۔ علامہ دوسروں کو بھی توکل علی اللہ کی تلقین فرماتے اور اس انداز میں نصیحت کے کلمات کہتے کہ یاس و ناامیدی کی بجائے امید و رجا اور حوصلہ پیدا ہو۔

ان تمہیدی سطروں کے بعد فقیر سید وحید الدین بیان کرتے ہیں کہ شیخ اعجاز احمد (علامہ اقبال کے برادر زادہ) ۱۹۲۲ء میں جب انکم ٹیکس افسر مقرر ہو کر ٹریننگ کیلئے پشاور بھیجے گئے اور وہاں ایک عیسائی ٹریننگ افسر کے تعصب سے سابقہ پڑا تو انہوں نے اس افسر کے غیر ہمدردانہ اور متعصبانہ رویّے کا حال لکھ کر علامہ کو بھیجا۔ علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ رزق انسان کا عمرو زید کے ہاتھ میں نہیں، اللہ کے ہاتھ میں ہے ؎

رزق از وے جو، مجو از زید و عمر
مستی از مئے جو مجو از بنگ و خمر

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے اور ہر قسم کی فکر کو نکال دینا چاہیئے، خدا کارساز ہے اور انسان کی فکر اس کے لئے باعثِ آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر کیا، خدا تعالیٰ رزق کا کوئی اور سامان پیدا کر دے گا۔

اسی ذیل میں فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۱ء میں جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو وہاں انہیں اطلاع ملی کہ ان کے بڑے بھائی بیمار ہیں اور سیالکوٹ کے متعلق منشی طاہر دین نے لکھا کہ ان کے فیل ہو جانے کی افواہیں گرم ہیں، اس پر علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"برادر مکرم کی طبیعت کی ناسازی کی خبر سن کر مجھے ایک گونہ فکر پیدا ہوئی ہے زندگی اور موت، رنج و راحت، سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

انشاء اللہ ان سے ملاقات ہوگی اور میں ان کو تندرست پاؤں گا، جہاں تک تعلق طاہر دین کا ہے، جس نے بنکوں کے متعلق فکر کا اظہار کیا تھا، اس سے کہہ دینا چاہیئے کہ فکر کی بات نہیں، میرے تمام معاملات، جان و مال اور روپیہ اللہ کے سپرد ہے، جب سے میں نے ایسا کیا ہے، مجھے کوئی تردد نہیں ہوتا، اس کی (یعنی اللہ تعالیٰ) کی مرضی میری مرضی ہے۔"

ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں ہمیشہ خوشنودی باری تعالیٰ پر نظر رکھنے والے اقبال نے کہا تھا:

"اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے تو اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناخوش ہے، برخلاف اس کے ناانصافی کا مطلب خدا اور رسول کو ناخوش کرنا ہے، جس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے، میں اور لوگوں کی حرف گیری آسانی سے برداشت کر سکتا ہوں، خدا اور رسول کی ناراضی سے میرا دل کانپتا ہے۔"

احترام رسولؐ کے سلسلہ میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں:

علامہ اقبال حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ اقدس سے بے پناہ محبت اور والہانہ عشق رکھتے تھے، ایک روز میں ان کے مکان پر پہنچا، تو علامہ کو بہت زیادہ فکرمند، مغموم اور بے چین پایا، گھبرا کے دریافت کیا، خیریت تو ہے کہ آج آپ خلافِ معمول بہت زیادہ مضطرب اور پریشان ہیں، علامہ نے ایک مخصوص انداز میں نظریں اوپر اٹھائیں اور غم انگیز لہجے میں فرمایا: یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے۔"

اس کے بعد حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں:

علامہ مرحوم کی تاریخ پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء ہے، اس حساب سے ۱۹۳۸ء میں انتقال کے وقت عاشقِ رسول کی عمر رسول اکرمؐ کے سنِ مبارک سے دو سال کم یعنی ۶۱ سال تھی، گویا اللہ تعالیٰ نے علامہ کی تمنا اور دعا قبول فرمالیا۔"

علامہ اقبال نے اپنی گفتگو میں ایک موقع پر ایک انگریز جرنیل کا ذکر کیا جو اکثر ان کے پاس آیا کرتا تھا اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ کہنے لگا، مجھے قرآن بہت پسند ہے، اکثر میرے مطالعہ میں رہتا ہے، علامہ نے دریافت کیا کہ آپ نے قرآن کریم میں ایسی کون سی چیز دیکھی، جو آپ کو اس قدر پسند آئی۔ جرنیل نے جواب دیا قرآن میں دلیری اور مردانگی کی باتیں بہت ہیں، جن کو پڑھ کر انسان میں جرأت اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔"

نماز، قرآن اور معلم قرآن کی جو عظمت اور اہمیت علامہ اقبال کی نظر میں تھی، اس کے بارے میں علامہ کے برادر زادہ شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے جب [illegible] کوٹ میں وکالت شروع کی تو اکثر خطوط میں نماز اور تلاوتِ قرآن کی تلقین کرتے، خود انہو[illegible] مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی قرآن کریم ختم کر لیا تھا، مجھے تاکید فرمائی کہ کسی حافظِ [illegible] سے قرآنِ کریم دہرالو، ان دنوں سیالکوٹ کی ایک مسجد کے امام نابینا حافظِ قرآن تھے، ان کا نام محمد رمضان تھا۔ جنہیں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن پڑھانے کا بہت شوق تھا، قرآن پڑھانے کی کوئی اجرت نہ لیتے تھے، جس نوجوان کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے اس کا نام اپنی پاکٹ بک میں لکھوا لیتے۔ حافظ رمضان صاحب کو علامہ اقبال کا کلام سننے کا بڑا شوق تھا، ایک بار عدالت کی تعطیلات میں علامہ سیالکوٹ تشریف لائے ہوئے تھے کہ حافظ صاحب کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا اور انہوں نے علامہ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا، میں نے ذکر کیا اور پوچھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو حافظ صاحب کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ علامہ نے جواب میں کہا: "وہ تمہارے استاذ ہیں،

اور وہ تھی قرآن کے، ان کی عزت ہم پر لازم ہے، اس کے بعد خود حافظ صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ حافظ صاحب کی عادت تھی کہ نئے آدمی سے ملتے تو اس کے چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر اس کی شناخت کرتے، جو لوگ بصارت سے محروم ہو جاتے ہیں ان کی قوتِ حاسہ بہت زیادہ تیز اور نازک ہوتی ہے، اور انگلیاں آنکھوں کا کام دیتی ہیں، لہٰذا حافظ صاحب نے قوتِ لامسہ کے ذریعہ علامہ کی شناخت بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لی۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ معلم قرآن کا مرتبہ علامہ اقبال کی نظر میں کتنا اونچا تھا، اس کے بعد یہ دیکھئے کہ وہ قرآن حکیم کا احترام کس درجہ کرتے تھے۔ شیخ اعجاز احمد ہی کے بیان کے بموجب علامہ کی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی وزیر آباد کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی، غالباً اس لئے کہ یہاں شادی کے بعد ایک دو سال میں کوئی اولاد نہیں ہوئی، ان کی خوشدامن نے سسرال میں انہیں رہنے نہ دیا، تلخی اس قدر بڑھی کہ علامہ کی ہمشیرہ میکے چلی آنے پر مجبور ہو گئیں اور کئی سال یہیں رہیں، ان کی ساس نے بیٹے کی دوسری شادی بھی کر دی، پھر نہ معلوم کیا واقعات پیش آئے کہ ان کی ساس اپنی بہو (علامہ کی ہمشیرہ) کو دوبارہ سسرال لانے پر مصر ہو گئیں، وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ علامہ کے والد کے پاس تشریف لائیں، کہ طرفین کے رشتہ داروں میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے، پہلے تو ادھر سے انکار ہوتا رہا، پھر بہت سوچ بچار کے بعد علامہ کے والدین رضامند ہو گئے، اتفاق سے اس دوران علامہ بھی سیالکوٹ پہنچ گئے، انہیں جب صورتِ حال کا علم ہوا تو برہمی کی کوئی انتہا نہ رہی، سابقہ حالات کے پیشِ نظر انہیں غصہ آ گیا اور انہوں نے صلح پر رضامندی سے انکار کر دیا۔ والد نے جوان کو غصہ میں دیکھا تو فوراً کہا، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں "والصلح خیر" (صلح و صفائی میں بہتری ہے) فرمایا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ علامہ چپ ہو گئے، قدرے توقف کے بعد والد نے ان سے پوچھا کہ پھر کیا فیصلہ

کیا جائے۔ علامہ آبدیدہ ہو گئے اور بولے "وہی ہو قرآن کہتا ہے" چنانچہ معالجت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ صلح خیر ہی ثابت ہوئی۔

علامہ اقبال کا ذہن نہایت نکتہ رس تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب مسدس حالی کے صدی ایڈیشن کی تقریب منائی گئی۔ تو اس تقریب میں علامہ بھی تشریف لے گئے تھے اس تقریب سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر راجہ حسن اختر نے اس طرح کیا ہے:

میں بھی علامہ کے ہمراہ تھا۔ تقریب کے خاتمہ پر منتظمین کی طرف سے مدعوئین کی فوٹو کا انتظام کیا گیا۔ فوٹو کے لئے حضرت علامہ کی کرسی صدر جلسہ نواب صاحب بھوپال کے ساتھ رکھی گئی، اس بات کی اطلاع مولانا حالی کے صاحبزادے نے ہمیں دی، حضرت علامہ یہ سن کر وہاں سے چل دیئے اور اپنی جائے رہائش پر پہنچ گئے، وہاں سے سامان لے کر اسٹیشن پر پہنچے، میں حیران تھا کہ فوٹو میں شامل ہونے سے آپ نے کیوں اجتناب فرمایا، ویٹنگ روم میں علی بخش نے حقہ تازہ کر کے پیش کیا، آپ نے ہلکے ہلکے کش لگانے شروع کر دیئے، میں نے تصویر میں نہ شامل ہونے کے معمہ کو معلوم کرنے کی غرض سے پوچھا کہ ہمارے علماء کے نزدیک فوٹو کھینچوانا حرام ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ علامہ بولے "بات تو صحیح ہے۔

علامہ کا دل انسانی ہمدردی، غریب پروری اور کسی بیوہ کی غم خواری سے خالی نہیں تھا —— مولانا عبدالمجید سالک بیان کرتے ہیں کہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کا پونے دوسو روپے ماہوار کرایہ دیا کرتے تھے، ہزار دفعہ عرض کیا کہ یہ کوٹھی اتنے کی نہیں، آپ کیوں روپیہ برباد کرتے ہیں"۔ لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ یہ کوٹھی ایک ہندو بیوہ کی ہے، جس کے بچوں کی گزران اسی کے کرایہ پر ہے، مجھے کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو نہایت پابندی سے پونے دوسو روپے اس بیوہ کو بھیج دیا کرتے تھے۔

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ مذہبی زندگی اچھی صحت کی ضمانت ہوتی ہے۔ اسی طرح بزرگوں کی صحبت ایک انسان کے لئے اکسیر کا کام کرتی ہے۔ اسی سلسلہ میں فقیر سید وحید الدین بیان کرتے ہیں :

علامہ اقبال خاندان کے نوجوانوں کو جسمانی ورزش کی تاکید فرمایا کرتے، ایک مرتبہ وہ سیالکوٹ آئے ہوئے تھے، لعل دین پہلوان اُن سے ملنے کے لئے آئے، جو شیخ صاحب کے محلے کے قریب رہتے تھے اور وہیں ان کا اکھاڑہ تھا، علامہ نے شیخ صاحب کو ان کے سپرد کیا اور روزانہ اکھاڑے جا کر کسرت کرنے کی تاکید کی۔ علامہ اکثر تاکید کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے زندگی کو باقاعدہ اور سادہ بنانے کی کوشش کرو۔ جوانی کی توانائی سے فائدہ اٹھانا چاہیے، تاکہ صحت دیر تک قائم رہے۔ جسمانی اور روحانی صحت کی ضامن مذہبی زندگی ہے، وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا معمول رہنا چاہئے۔ بزرگوں کی صحبت میں اکسیر کی تاثیر ہے۔

عام طور پر لوگ مسواک کی اہمیت، افادیت اور برکت سے ناواقف ہیں مگر مغربی اور مشرقی علوم اور نبوی سنت سے آگاہ اقبال اس سے کیونکر ناواقف رہ سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کا جو نقطۂ نظر تھا، وہ بہت سارے لوگوں کے لئے شاید چونکا دینے والا واقعہ ثابت ہو۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں :

علامہ اقبال ایک بار گھر کی صفائی ستھرائی پر گفتگو کر رہے تھے، انہوں نے بتایا کہ اسلام نے صفائی پر کتنا زور دیا ہے، پھر دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کے فوائد کا ذکر کیا، کچھ عرصہ بعد ایک خط میں شیخ صاحب نے علامہ سے دریافت کیا کہ اب تو اچھے اچھے ولایتی منجن ملتے ہیں، کیا وہ مسواک کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے لکھا کہ :

مسواک سے میری مراد دیسی مسواک تھی، نہ کہ انگریزی طرز کے منجن اور برش، کیونکہ

یورپ کی بنی ہوئی بعض چیزیں خوبصورت ضرور ہوتی ہیں، مگر ان میں اخلاقی زہر ہوتا ہے، جن کا اثر آج کل کے مادہ پرست مزاج رکھنے والے انسان فوراً محسوس نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد فقیر سید وحید الدین اپنا تأثر اور مشاہدہ بیان کرتے ہیں:

"یورپ کے قیام کے دوران میں ہو سکتا ہے کہ دیسی مسواک نہ ملنے کے سبب علامہ اقبال نے انگریزی منجن وغیرہ استعمال کیا ہو، لیکن لاہور میں ان کے غسل خانہ میں ایک دیسی مسواک ضرور ہوتی تھی، مسواک کا استعمال اس لئے مبارک اور مفید ہے کہ اس میں سنت رسولؐ کی اتباع مضمر ہے۔ یہی مقدس جذبہ تھا جس نے مسواک کو علامہ کی نگاہ میں محبوب بنا دیا تھا۔"

سب جانتے ہیں کہ علامہ اقبال نے بنیادی طور پر عصری اور مغربی علوم کی تحصیل میں اپنا وقت لگایا، لیکن ابتدائی زمانہ کے اساتذہ کی تعلیم و تربیت، علماء اور اہل دین کی صحبت اور مسلسل مطالعہ اور کتب بینی نے انہیں اسلامی علوم و فنون کا بھی رمز شناس بنا دیا۔ تاہم انہیں یہ احساس رہا کہ کاش میں اپنی پوری صلاحیتیں دینی علوم کے پڑھنے میں صرف کرتا، چنانچہ ایک مرتبہ علامہ نے اپنی چھوٹی ہمشیرہ کو لکھا:

"میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ پڑھنے میں گنوائی، خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے، اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسولؐ کے دین کی میں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والد مکرم مجھے دینی علوم ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا کے علم میں تھا ہوا، اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہئے تھا، اور زندگی تمام و کمال نبی کریمؐ کی خدمت میں بسر ہونی چاہئے تھی" (حیاتِ اقبال صفحہ ۱۲۲)

آپ نے اب تک علامہ اقبال سے متعلق جن واقعات کو پڑھا اور ان واقعات میں جا بجا

علامہ اقبال کی جو باتیں آتی رہیں ان تمام میں گہری معنویت ہے۔ ان سے فکر و نظر کا زاویہ بنتا ہے اور اخلاق و عمل کے لئے راہ متعین ہوتی ہے۔ تاہم حیاتِ اقبال (از ایم ایس ناز) سے مستفاد اس مطالعاتی مضمون کو علامہ اقبال کی ایک اہم بات پر ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ بات عصر حاضر کے لئے ایک "پیغام" کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں:

ایک مرتبہ علامہ اقبال نے مجھے خط میں لکھا کہ جرمنی کے مایۂ ناز شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر نوجوانوں کے روحانی اضطراب اور دلی بے چینی کو محسوس کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا: ARTSTILL HAS TRUTH. TAKE REFUGETHERE (آرٹ اپنے اندر صداقت، حقیقت اور اطمینان رکھتا ہے، اس سے وابستہ رہو)

اس وقت دنیائے اسلام کی وہی حالت ہے، جو نپولین کے وقت جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمانوں کے لئے وہی ہے، جو گوئٹے نے دیا تھا، صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے ART کی جگہ RELIGION رکھ دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹ میں اطمینان و مسرت ضرور ہے، مگر قوت نہیں، مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔ (حیاتِ اقبال صفحہ ۲۲۳)

مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے مسائل کا ایک انبار لگا ہوا ہے، اہلِ قلم اور اصحابِ فکر و نظر ان مسائل کے بارے میں برابر سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کی تمام تر کوششیں قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہیں، تاہم ایسے تمام مواقع پر جب کہ مسلمانوں کے مسائل زیرِ بحث آتے ہیں، ایک سوال لوگوں کے دل و دماغ کو بے چین کئے رہتا ہے کہ آخر مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سوال کے مختلف جواب سامنے آئیں، مگر میں چاہتا ہوں کہ ایک جواب کی طرف آپ کے ذہن و دماغ کو متوجہ کروں، توقع تو یہی ہے کہ یہ جواب آپ کے دل کی آواز ثابت ہوگا، اور اسے کوئی رخ اور سمت دیئے بغیر غیر جانبدارانہ عصبیت کی ہر عینک کو اتار کر چشمِ حقیقت وا کئے اس کا آپ مطالعہ کریں گے۔

انسانی جسم کی تمثیل

اس سے پہلے کہ میں اصل جواب کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں

مناسب سمجھتا ہوں کہ انسانی جسم کی ایک تمثیل پیش کروں ، سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انسان کے چاروں طرف فضاء میں سینکڑوں بیماریوں کے جراثیم اڑتے رہتے ہیں ۔ اس میں بہت سے جراثیم ٹی ۔ بی ، ہیضہ ، پلیگ اور ملیریا جیسے مہلک امراض کے بھی ہوتے ہیں ۔ یہ جراثیم سانس کے ساتھ جسم کے اندر داخل ہوتے ہیں ۔ پھر بھی نظام جسمانی میں کوئی خلل نہیں پڑتا ، اطباء اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ان جراثیم کے جسم کے اندر داخل ہونے کے بعد بظاہر آدمی کا بیمار ہونا ضروری ہے' لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا ہے ۔ جسم کے اندر ایک مدافعت کی قوت ہوتی ہے ۔ جو ہر لمحہ ان مہلک جراثیم سے لڑتی رہتی ہے ۔ اور اس قوائے جسمانی کو مغلوب نہیں ہونے دیتی ، لیکن جب جسم کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جاتی ہے تو یہی نظر نہ آنے والے جراثیم اچھے بھلے ، تندرست و توانا آدمی کو بیمار کر دیتے ہیں ۔

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ملتِ اسلامیہ کی مثال بھی ایک جسم کے مانند ہے ، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ملت کی قوتِ مدافعت یا دوسرے لفظوں میں مسائل سے نمٹنے کی استعداد ختم ہو گئی ہے مسائل پر غلبہ پانے کی بجائے وہ مسائل سے مغلوب ہو گئی ہے ، ہم دیکھتے ہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں سے زیادہ چھوٹی اقلیتیں ہیں ، ان کے وسائل بھی محدود ہیں ، لیکن وہ اپنے مسائل خود ہی حل کر لیتی ہیں ، مسلمانوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہر وقت مسائل کا رونا نہیں روتیں ، ان کے اندر قوتِ مدافعت بھی ہے اور قوتِ فکر و عمل بھی ، ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا ہے تو نہ حکومت سے فریاد کرتی ہیں' اور نہ احتجاج کا سلسلہ دراز کرتی

ہیں، اور نہ ہی میمورنڈم پر میمورنڈم پیش کرتی چلی جاتی ہیں، بلکہ وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور اس وقت تک دم نہیں لیتیں، جب تک کہ اس مسئلہ کو حل نہ کرلیں۔ آپ یہاں پر نہ سوچیئے کہ کسی جمہوری ملک میں احتجاج اور میمورنڈم کا میں قائل نہیں ہوں۔ بلاشبہ وقت اور حالات کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی مفید ہوتی ہیں۔ لیکن انہیں پر تکیہ اور بھروسہ کرلینا اور مثبت سعی و کوشش کے راستے کو اختیار کرنے سے پہلوتہی کرنا اور حوصلہ وہمت اور باہمی اتحاد و یک جہتی کے ساتھ میدانِ عمل میں اترنے سے ہچکچانا، تحفظ ذہنی سے کام لینا یا ذہن ودماغ میں خطرات، وساوس اور "اندیشہ ہائے دور دراز کو بسانا، کسی بھی زندہ قوم کا طور طریق نہیں رہا ہے۔ یہ بات قدرے اطمینان کی ہے کہ اب اس مسئلہ میں مسلمانوں کا شعور بیدار ہورہا ہے' اور منزل کی تعیین کے بعد اس سمت انہوں نے اپنے سفر کا آغاز بھی کردیا ہے لیکن شعور کی بیداری کی جو شرح مقصود ہے، اسے وہ حاصل نہیں کرسکے ہیں، اسی لئے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہورہے ہیں، اس موقع پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے کیا کرنا چاہیئے اور مسلمانوں میں قوتِ مدافعت یا مسائل سے نمٹنے کی استعداد کیسے پیدا کی جائے؟۔

مذکورہ بالا سطور میں ہم نے انسانی جسم کی مثال دی ہے' اطباء اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ انسانی جسم میں قوتِ مدافعت اعضاء کی توانائی اور باہمی طور سے مل کر کام کرنے سے پیدا ہوتی ہے، ایک عضو بھی ٹھیک سے کام نہ کرے تو پورے نظامِ جسمانی میں خلل واقع ہوجاتا ہے، یہی حال ملّت کا بھی ہے، ملّت بھی ایک جسم کے مانند ہے، جب ملّت کے سبھی اعضاء

اپنی اپنی جگہ اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے ایک نظام کے تابع ہوتے ہیں تو پھر ملت کے اندر ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ بڑے سے بڑا مسئلہ چٹکیوں میں حل کر لیتی ہے۔

ایک اور تمثیل

اس اہم اور بنیادی حقیقت کو ہوائی جہاز کی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، لوہے کی اس عظیم دیو ہیکل مشین کو ہم آسمان میں اڑتے ہوئے روزانہ ہی دیکھتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ لوہے کی اس مشین میں اڑنے کی طاقت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ جیسے ملت لاکھوں اور کروڑوں افراد پر مشتمل ہوتی ہے، اسی طرح یہ مشین بھی لاکھوں پرزوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے، اگر اس میں سے ایک پرزہ بھی خراب ہو جائے یا اپنا کام کرنا بند کر دے، تو یہ مشین ہوا میں اڑنے سے معذور ہو جائے گی، یہ زمین پر پڑی رہے گی، لوگ اسے ہوائی جہاز ہی کہیں گے، لیکن اس میں ہوا پیمائی کی صلاحیت باقی نہ رہے گی، جب ہوائی جہاز کے سارے پرزے مل کر کام کرتے ہیں تو اس کے اندر قوت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ زمین سے اوپر اٹھ کر آسمان میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

تمثیلوں کا حاصل

ان دونوں تمثیلوں کے ذریعہ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ قوت کا سرچشمہ اتحاد اور بامقصد تنظیم ہے، آج کل لوگ جب اتحاد اور تنظیم کا لفظ استعمال کرتے ہیں، تو ان کے دماغ میں کوئی

واضح تصور نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی ہوائی جہاز اور انسانی جسم کی مثال سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اتحاد اور تنظیم کو کارگر بنانے کے لئے اس کا بامقصد ہونا بھی ضروری ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ علم بھی ہے، دولت بھی ہے اور صلاحیت و استعداد بھی ہے۔ ان کی تنظیمیں اور ادارے بھی ہیں، ان کے وزراء (اگرچہ قلیل تعداد میں) بھی ہیں، پارلیمنٹ اور قانون ساز مجالس نے بھی انکی نمائندگی (مختصر طور پر ہی سہی) حاصل کی ہے، سب کچھ ہے لیکن اتحاد اور تنظیم کا فقدان ہونے کی وجہ سے ان میں نہ وزن ہے نہ قوت' اور نہ ہی پارلیمنٹ اور اسمبلی میں مسلم آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ممبران کی موجودگی۔ ماضی کا تجزیہ بتاتا ہے کہ ان ممبران کی تعداد دن بدن گھٹتی ہی چلی جارہی ہے گویا زمانہ شناسی اور سیاسی بصیرت جو مسلمانوں کو ورثہ میں ملی تھی' وہ گم ہوگئی ہے اور باہمی اختلاف، ضد اور نفسانیت کا دور دورہ ہے۔

ع پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے

ایک حکیمانہ بات

مجھے اس موقع پر بہت سے اکابر علماء و مشائخ کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ یاد آرہے ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک دفعہ اپنی مجلس میں فرمایا کہ "اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں کے اندر اوروں سے زیادہ سلطنت کرنے کی صفات موجود ہیں، مثلاً عدل و انصاف ہمدردی، غمخواری اور ترحم وغیرہ، مگر بس کمی یہ ہے کہ ان میں نظم نہیں اور نظم نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان میں اتفاق و اتحاد نہیں اور اتحاد و اتفاق

کی جڑ "تواضع" (جھکنا) ہے۔ اگر ہر شخص دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھنے لگے تو پھر نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ نااتفاقی اسی سے تو پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے افضل سمجھتا ہے، اور اس سے بڑھنا چاہتا ہے، اس پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ تواضع کی صفت کیوں کر پیدا ہوتی ہے؟ فرمایا کہ تواضع اختیاری چیز ہے۔ دوسروں کے ساتھ تواضع کا برتاؤ کرے خواہ نفس کو ناگوار ہو، بس اسی سے تواضع پیدا ہو جائے گی، اگر تواضع کی صفت بھی پیدا نہ ہو، صرف عمل ہی تواضع کے خلاف نہ ہو تو یہ بھی کافی ہے، اب تو حال یہ ہے کہ کسی کو اپنا بڑا تسلیم کرنے میں عار آتی ہے اور جب تک کسی کو بڑا تسلیم نہ کر لیا جائے، مرکزیت جو نظم کے لئے ضروری ہے قائم نہیں ہو سکتی "۔

حضرت حاجی صاحبؒ کی یہ باتیں حکمت سے لبریز ہیں، مگر کتنے لوگ ہیں جو اس طرح کی حکیمانہ باتوں پر غور کرتے ہوں، یہاں تو اپنے مزاج اور طبیعت کا سکہ چلانا ہے، خواہ مجموعی طور پر ملت کا کچھ بھی ہو، آج ضد اور انتقامی جذبات سے بھرے ہوئے سینے نے بہت سارے مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور کوئی شخص اپنے بنائے ہوئے خول سے باہر آنے کے لئے تیار نہیں ہے، حالانکہ جسے اتحاد کہتے ہیں وہ نام ہے اختلاف کے باوجود کا، یعنی بہت سارے امور اور مسائل (خواہ وہ مسلکی ہوں یا سیاسی) میں اختلاف رکھتے ہوئے مشترکہ مسائل کے حل میں باہم متحد اور متفق ہو کر سعی و کوشش کرنا، ایسی مخلصانہ سعی و کوشش کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرنے کی ذمہ داری اللہ تبارک و تعالیٰ نے لی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم کی آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے واضح ہے، مگر باہم دوری

اور کشیدگی کا حال یہ ہے کہ ؎

وہ رک کر نہیں ملتے ہم جھک کر نہیں ملتے
کچھ وہ بھی سمجھتے ہیں کچھ ہم بھی سمجھتے ہیں

اور یہ بھی کہ ؎

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

اگر اختلاف ان میں باہم دِگر تھا

کون نہیں جانتا کہ اسلام جب عربوں کے درمیان آیا تو ان میں سخت افتراق اور انتشار پھیلا ہوا تھا، عداوت، دشمنی اور انتقام کے نشہ میں پوری قوم سرشار تھی۔ ہر شخص اور ہر خاندان، ہر قبیلہ اپنی انا کا پرستار تھا، ذرا بھی انا کو ٹھیس لگی اور تلواریں میان سے باہر آگئیں، اسلام نے آتے ہی ان سے سمع و طاعت کا مطالبہ کیا اور انہوں نے بھی پوری زندگی اسلام کے حوالہ کر دی، جس کے نتیجہ میں اسلام نے ان کو اس طرح متحد کر دیا کہ وہ آپس میں مل کر ایک خاندان کی طرح رہنے لگے اور پھر جو عروج نصیب ہوا وہ کسی دوسری قوم کو دیکھنا میسر نہیں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں اتحاد و تنظیم پیدا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں؟ بلاشبہ آج بھی اسلام میں وہ قوت موجود ہے لیکن ہم میں وہ بات نہیں رہی۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ جو باتیں ہمیں اچھی اور سہل لگتی ہیں، انہیں اپنا لیتے ہیں، باقی کے بارے میں کوئی نہ کوئی عذر کر لیتے ہیں، دوسرے لفظوں میں اسلام کے تحت آنے

کی بجائے ہم نے اسلام کو اپنے تحت کر لیا، اس لئے نتیجہ وہ سامنے نہیں آرہا ہے جو "خیرالقرون" میں سامنے آیا تھا۔ غیظ و غضب اور جوشِ انتقام سے بھری ہوئی اور باہم جنگ و جدال میں پڑی ہوئی قوم کو جب اسلام نے سنوارا (اور وہ صحابہؓ کے مقدس لفظ سے جانے پہچانے لگے) تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے "خودسپردگی" کا جو عالم تھا اسے مولانا الطاف حسین حالیؒ نے "مسدس حالی" میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

رہِ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ ان کی فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کر دیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم، گرما گئے وہ

اگر انسان ہونے کے ناطے کبھی ان (صحابہؓ) کے درمیان اختلاف اُبھر آتا اور نوبت لڑائی جھگڑے کی آجاتی تو اس کا منظر بھی "مسدس حالی" میں موجود ہے، مولانا حالیؔ فرماتے ہیں ؎

اگر اختلاف ان میں باہم دِگر تھا تو بالکل مدار اس کا اخلاص پر تھا
جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا خلاف آشتی سے خوش آئند تر تھا
یہ تھی موج پہلی اس آزادگی کی
ہرا جس سے ہونے کو تھا باغِ گیتی

حیاتِ صحابہؓ، مینارۂ نور

حضراتِ صحابہؓ کی زندگی ہمارے لئے "مینارۂ نور" ہے، اور پر جو

نقشہ کھینچا گیا ہے، اس کی متعدد مثالیں تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں، مگر یہاں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کیا جاتا ہے ـــــ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے باہمی اختلاف سے تاریخ اسلام کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ ان دونوں کا اختلاف شباب پر تھا، روم کے بادشاہ قیصر نے ان اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور شام کے سرحدی علاقوں پر لشکر کشی کرنے کا ارادہ کیا، حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع مل گئی، آپ نے اس موقعہ پر قیصر کے نام جو خط لکھ کر روانہ فرمایا اس میں ہمارے لئے عبرت ونصیحت کے صدہا موتی چھپے ہیں، تاریخ کی ایک کتاب سے درج ذیل اقتباس پڑھئے :-

"حضرت معاویہؓ نے قیصر روم کو لکھا کہ "مجھے اس بات کا علم ہوا ہے کہ تم سرحد پر لشکر کشی کرنا چاہتے ہو، یاد رکھو! اگر تم نے ایسا کیا تو میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کرلوں گا اور ان کا لشکر جو تم سے لڑنے کے لئے روانہ ہوگا اس کے ہراول دستے میں شامل ہوکر قسطنطنیہ کو تہس نہس کردوں گا۔" جب یہ خط قیصر روم کے پاس پہونچا تو وہ اپنے ارادہ سے باز آگیا اور لشکر کشی سے رک گیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے مقابلے میں اب بھی ایک جسم وجان کی طرح ہیں اور ان کا اختلاف دنیا کے عام لوگوں کا سا اختلاف نہیں ہے۔"

(حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق از مولانا محمد تقی عثمانی صفحہ ۲۴۲)

مسدس حالی کے دو بند

تاریخ کے اس سبق آموز واقعہ کو مطالعہ میں لانے کے بعد آئیے دوبارہ "مسدس حالی" کھولیں اور اس کے یہ دو بند پڑھیں کیا عجب کہ ان کو پڑھنے کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں اور "بری حالت" کو "اچھی حالت" میں بدلنے کا ذوق و شوق اور حوصلہ و ہمت پروان چڑھے، مولانا حالی یہ حال بیان فرماتے ہیں ؎

خصومت سے ہیں اپنی گو خواریاں سب — نزاعوں سے باہم کی ہیں ناتواں سب
خود آپس کی چوٹوں سے ہیں خستہ جاں سب — یہ ہیں متفق اس پر پیر و جواں سب
کہ نا اتفاقی نے کھویا ہے ہم کو
اسی جزر و مد نے ڈبویا ہے ہم کو

یہ مانا کہ کم ہم میں ہیں ایسے دانا — جنہوں نے حقیقت کو ہے اپنی چھانا
تنزل کو ہے ٹھیک ٹھیک اپنے جانا — کہ ہم ہیں کہاں اور کہاں ہے زمانا
یہ آتا زبانوں پہ ہے سب کے جاری
کہ حالت بری آج کل ہے ہماری

سر سید کی باتیں

اگر کسی وجہ سے اتحاد و اتفاق کی دیوار میں رخنہ آجائے تو اسے درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر یہ مرحلہ طے نہیں ہوا ہے تو کم از کم اسے بڑھاوا نہ دیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اپنی زبان کو بدگوئی، الزام تراشی اور شخصی اہانت آمیز ریمارک سے محفوظ رکھا جائے اور ان حدود و آداب کی رعایت کی جائے جو مہذب سماج میں اختلاف اور مخالفت کے وقت ضرورت سمجھے جاتے ہیں، سر سید

احمد خاں مرحوم جنہوں نے معاشرتی اور اخلاقی موضوعات پر اپنی دل آویز اور سبق آموز تحریروں کا ایک عظیم اور قابلِ قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان میں ایک مضمون "مخالفت" کے عنوان سے ابھی حال میں نظر سے گذرا ہے موضوع کی مناسبت سے جی چاہتا ہے کہ اس کا یہ حصہ پیش کیا جائے، سرسید لکھتے ہیں:

"دنیا میں یہ بات قریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر گو وہ کیسی ہی صحیح اور سچ ہو، متفق ہو جائیں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو، نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیکدلی سے سوچتا ہے، اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو چن لوں اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کرلوں اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے کہ جیسے ایک دل سوز دوست بتایا ہے کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کیلئے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کی میٹھا ۔۔ اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے اور باوجود مخالفت کے ایک ۔سرے کو فائدہ پہونچتا ہے ـــــ کمینہ طبیعت، نا مہذب اور ناشائستہ آدمی یہ راستہ نہیں چلتا، وہ بات کے حسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی سے بحث کرنے لگتا ہے سخت کلامی، درشت گوئی، سب و شتم اپنا پیشہ کرلیتا ہے، اپنے مخالف کے عیوب واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے، اور جھوٹی جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور مورد لعنۃ اللہ علی الکاذبین بنتا ہے۔

اس راہ پر چلنے سے اور جھوٹ اتہام کرنے سے اور لعنتِ خدا کا مورد

بننے سے اس کا مطلب اپنے مخالف کو بدنام کرنا اور عام لوگوں میں جو اس کے مخالف کے حال سے واقف نہیں ہیں، ناراضی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت اس کا یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا اور بہ عوض اس کے کہ اس کا مخالف بدنام ہو، خود ہی زیادہ رسوا و بدنام ہوتا ہے، اس لئے کہ جب اس مخالف کی برائی جو اس نے براہِ کذب و اتہام اس کی نسبت سے منسوب کی ہے۔ مشہور ہوتی ہے تو کوئی اس کو سمجھتا ہے اور بہت لوگ اس کی تحقیق کے درپے ہوتے ہیں اور جب اس کی کچھ اصل نہیں پاتے تو بہ عوض اس کے مخالف کے خود اسی کذاب پر لعنت اور تھوتھو کرتے ہیں اور بقول شخصے کہ دروغ کو فروغ نہیں ہوتا، تھوڑے ہی دنوں میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ جھوٹا، بدگو خود اسی گڑھے میں گرتا ہے جو اس نے اپنے مخالف کے لئے کھودا تھا۔

پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے مخالف سے مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی، نیکی، نیک دلی کو کام میں لائے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے، ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔"

چند حدیثیں

ان گذارشات کا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان میں آج ملتِ اسلامی جن مسائل سے دوچار ہے، ان سب کی تہہ میں بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ اسکے مختلف اجزاء میں ربط و تعاون کا فقدان ہے۔ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ اور اکثر متصادم بھی ہیں۔ اختلاف کے وقت انتقامی جذبات سے بھر کر

اپنی شخصی بالادستی اور انا کی تسکین کی خاطر وہ تمام شرعی اور اخلاقی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں، جن کا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں لحاظ اور پاس رکھنا چاہیئے تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ کسی آدمی کے لئے یہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کی تحقیر کرے، مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لئے حرام ہے (یعنی اس پر دست درازی حرام ہے) اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔" (صحیح مسلم) حدیث میں بہتان اور الزام تراشی کے سلسلہ میں بھی سخت وعید آئی ہے (ابوداؤد) قرآن میں افواہ طرازی اور بے تحقیق باتوں کو پھیلانے سے بھی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے (الحجرات) تاکہ مسلم معاشرہ بدگمانیوں کی لعنت اور انتشار و خلفشار کی برائی سے بچا رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "میں اس مؤمن کے لئے جنت کے کنارے ایک محل کا ضامن ہوتا ہوں جو برسرِ حق ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے (ابوداؤد) آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ "آپس میں اختلاف نہ کیا کرو، تم سے پہلے لوگ اختلاف ہی کی وجہ سے تباہ ہوئے۔" (بخاری) آپؐ نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے فرمایا کیا میں تمہیں ایسا عمل بتاؤں جو درجے میں نماز، روزے اور زکوٰۃ سے بھی افضل ہے۔ صحابہؓ نے کہا، ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتایئے، آپؐ نے فرمایا: آپس کی محبت اور میل جول نماز روزے اور زکوٰۃ سے بھی افضل ہے، پھوٹ اور آپس کا تفرقہ دین کو مونڈ دیتا ہے (ترمذی) آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ، بندگانِ خدا میں بہترین لوگ وہ ہیں کہ جب ان کے چہروں پر نظر کی جائے تو خدا یاد آجائے اور بدترین افراد وہ ہیں جو اِدھر اُدھر کی چغلیاں کھاتے اور پھوٹ ڈالتے پھریں، دوستوں

میں جدائی ڈلوائیں اور بے لوث لوگوں کو تہمت لگائیں (مشکوٰۃ) اگر کوئی شخص مسلمانوں میں تفرقہ ڈالتا ہے اور آتشِ اختلاف و فساد کو بھڑکاتا ہے تو آپؐ نے ایسے شخص سے اپنی سخت ناراضی کا اظہار کیا ہے اور اس کے برے انجام کی اطلاع دی ہے (نسائی) اس کی روشنی میں وہ لوگ غور کر سکتے ہیں جو انتقاماً یا اپنے بعض اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر دو مسلمانوں کے درمیان لڑائی کو ٹھنی رہنے دینا بہتر جانتے ہیں، یعنی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ایک ضرورت

ضرورت ہے کہ باہر سے اعانت اور امداد پر بھروسہ کرنے کے بجائے مسلمانوں کے اندر کی صلاحیت کو ابھارا جائے۔ اس سے جو قوت پیدا ہوگی وہ ملت کی اپنی حقیقی قوت ہوگی۔ اس قوت کا پیدا کرنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے، یہ قوت پیدا کر لی جائے تو باقی دوسرے مسئلوں کے حل کی راہ خود بخود کشادہ ہو جائے گی، اس قوت کے نہ ہونے سے مسائل کے حل کی راہ مسدود ہو گئی ہے، بلکہ ملت کا پورا وجود ہی ایک مسئلہ بن کے رہ گیا ہے، یہ قوت اگر حاصل ہو گئی تو اس سے ملت کے افراد کے ساتھ ملک و قوم کو بھی بہتر سے بہتر فائدہ پہونچے گا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کی تعمیر سامنے آئے گی کہ "لوگوں میں سب سے بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہونچائے۔"

ایک فکر انگیز تقریر

جی چاہتا ہے کہ زیرِ نظر مضمون کو مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا ربورڈ کے ایک بلیغ اور طاقتور اقتباس پر ختم کروں،
یہ اقتباس مضمون کا حسن اختتام بھی ہوگا اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کی بہترین
وضاحت اعلیٰ ترین الفاظ میں ہوگی، جس میں آپ مولانا کی دردمندی، سوز، اخلاص
اور حکمت وبصیرت سے آشنا دل ودماغ کی جھلک بھی محسوس کرسکتے ہیں، حضرت
مولانا علی میاںؒ نے جنوری ۱۹۸۴ء میں حیدرآباد ہی میں اپنی ایک فکر انگیز تقریر
کے دوران اپنے مخصوص انداز میں فرمایا تھا:

"آپس کے اتحاد کے لئے کوئی ایک دوسرے کو چپکانے والی اور ملانے والی
مادی شئی آج تک دنیا میں ایجاد نہیں ہوئی ہے بلکہ اتحاد وملت اللہ تعالیٰ کی
توفیق اور اس کا خاص انعام ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے
حضورؐ کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا: (ترجمہ) "اے نبی! اگر آپ ساری دنیا
کے خزانے بھی خرچ کردیتے تو ان صحابہ کے قلوب میں الفت (ومحبت اور اتحاد و
یگانگت) نہیں پیدا کرسکتے تھے، لیکن اللہ نے ہی (اپنے فضل وکرم سے بطور انعام و
احسان) ان میں آپس میں الفت (واتحاد) پیدا فرمادیا" ظاہری طور پر اگر کوئی چیز
اتحاد کے لئے محرک ہوسکتی ہے تو وہ خطرہ کا احساس ہے، جب خطرے کا
احساس پیدا ہوجاتا ہے تو انسان خود بخود متحد ہوجاتا ہے، ہم جو ہندوستان
میں آپسی انتشار کا شکار ہوکر ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کررہے
ہیں وہ خطرے کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے ہی ہے، میں الحمد للہ فطرتاً
رجائی واقع ہوا ہوں، یعنی میرا ذہن مایوسی کی طرف بہت کم جاتا ہے، اس
خطرناک دور میں بھی جس میں لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں کو خطرے میں
سمجھا اور یہ قیاس کیا کہ ہندوستان میں بھی اسپین کے سے حالات پیدا
ہوں گے تو میں ایسے وقت بھی مایوس نہیں ہوا، لیکن اب حالات کے گہرے

مطالعے کے نتیجے میں میرا ذہن اس طرف جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے حالات بہت بگڑتے جا رہے ہیں۔ یہاں حالت یہ ہے کہ اگر کسی فرد کو دوسرے فرد سے یا جماعت کو کسی دوسری جماعت سے ایک فیصد بھی اختلاف ہو تو سو فیصد مخالفت کی جاتی ہے، افسوس کہ ہم میں کردار کشی اور کسی کی عزت کو خاک میں ملا دینے کا مذموم جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کے برخلاف ہماری ہمسا قوم میں یہ بات ہمارے مقابلے میں چوتھائی بھی نہیں۔ مثلاً گاندھی جی سے اختلاف کے باوجود انہیں ذلیل کرنے، بدنام کرنے اور گرانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ خاص طور سے ہماری صحافت کا یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ مخالفت میں حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔

ایک ایسی ملت جو اپنے اندر اخلاقِ حسنہ کی ایک عظیم تاریخ رکھتی ہو اس کی یہ افسوسناک صورتحال ہے کہ ذرا بھی کسی فرد یا جماعت سے ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو کسی رعایت کے بغیر آگ کی طرح اس کی مخالفت کی جاتی ہے، کسی قیادت، شخصیت یا ادارے کا احترام اور اس کی افادیت کو تسلیم کرنا مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس ملک میں ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں کہ ہم اچھوت کی طرح ہو جائیں اجتماعی طور پر آپس میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے کی صلاحیت مسلمانوں سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ذرا سا کسی کو ابھرتا ہوا دیکھیں تو اس کی مخالفت میں سارا زور خرچ کر دینا ہمارا وطیرہ بن گیا ہے، ایسا بھی نہیں کہ کوئی شدید بنیادی اختلاف اور ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہے بلکہ صرف نظریاتی اختلاف ہی کو بنیاد بنا کر فساد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ماحول سے آنکھیں بند کر لینا اور فضا کو ہموار کرنے کی کوشش نہ کرنا ہماری عادت سی بن گئی ہے،

ہم نہ حالات کو سمجھنا چاہتے ہیں اور نہ ملکی نقطۂ نظر سے کبھی اس بات پر بھی غور کرتے ہیں کہ ہم اس ملک کو کچھ دے بھی سکتے ہیں؟ ہمارا حال ایک جزیرے کا بلکہ جزیروں میں جزیرے کا سا ہو گیا ہے، ملّتِ اسلامیہ خود ایک جزیرہ اور پھر جزیروں میں جزیرہ بن کے رہ گئی ہے، ہر ادارہ، ہر پارٹی بلکہ ہر انجمن ایک جزیرہ بن گئی ہے۔ میرے ذہن پر خوف طاری ہو رہا ہے کہ اس ملک کا اور اس ملک میں رہنے والوں کا کیا ہو گا؟ ابھی تک دیانتداری اور اخلاص کے ساتھ کسی طرف سے بھی یہ کوشش نہیں کی جارہی ہے کہ کسی ادارے، جماعت، انجمن یا فرد کی حقیقی افادیت اور اس کی قدر و قیمت کو سنجیدگی سے سمجھا جائے۔ ابھی تک اس کی بھی کوئی کوشش نہیں کی جارہی ہے کہ اکثریت صحیح معنی میں ہمیں سمجھے اور ہماری افادیت و ضرورت کو محسوس کرے۔"

مولانا علی میاںؒ کی اس پر تاثر اور حقیقت افروز بات کے بعد علامہ اقبالؔ کا یہ زبان زد عام مگر حد درجہ معنی خیز شعر بھی اپنی زبان پر لے آئیے:

؎ فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مسئلہ

تیس ۳۰ بنیادی نکات

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت فرقہ وارانہ کشیدگی (خواہ اس کے جو بھی عوامل اور محرکات ہوں) جو ملک کو کمزور اور کھوکھلا کررہی ہے، یہ ہر محب وطن کے لئے باعث تشویش اور لمحۂ فکر بنی ہوئی ہے، یہ ایسا موقع ہے جس سے ملک کے "وفادار" اور "غدار" کی پہچان ہورہی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ ملک مکمل طور پر تباہی کے دہانے پر پہنچے اور "خانہ جنگی" کے شعلے ہر چہار طرف پوری شدت کے ساتھ بھڑکنے لگیں، ملک کے اہلِ ہمت، اربابِ بصیرت اور دردمندانِ انسانیت کو بلا امتیاز مذہب و ملت آگے آنا چاہیئے اور اپنی جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم سے فرقہ واریت کے تخم کی بیخ کنی کرکے امن وشانتی اور میل ومحبت کے گل کھلانے چاہئیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اقبال سہیل نے بڑے پتے کی بات کہی ہے؎

جوانو! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہوجائیں، جو ہو عزمِ سفر پیدا

اس سفر کے لئے روانہ ہونے والے اہلِ حوصلہ اور اصحابِ

عزیمت کیلئے ضروری ہے کہ وہ نیک نیت اور پاک باطن ہوں۔
مصلحت اور مفادات کی زنجیر بوجھل بن کر ان کے قدم کو آگے
بڑھنے سے نہ روکے۔ یہ سفر مرحلہ وار سبک قدموں کے ساتھ، شرکار
سفر کی قلت و کثرت سے بے نیاز ہو کر درج ذیل خطوط، نشانات
اور نکات کو سامنے رکھتے ہوئے طے کیا جائے :۔

(۱) ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مسلمان اور ہندو کے
جن رہنماؤں نے قائدانہ اور مجاہدانہ رول ادا کیا ہے ان کی ایسی
تاریخ منظر عام پر لائی جائے جو حقیقت بیز اور ہر تعصب اور تنگ
نظری سے پاک ہو۔ ان رہنماؤں نے اپنی اس جدوجہد میں
جس اتحاد اور باہمی اعتماد کا ثبوت دیا ہے اس سلسلے کے واقعات
ایک خاص ترتیب کے ساتھ یکجا کئے جائیں تاکہ پڑھنے والوں پر
خوشگوار اثرات مرتب ہو سکیں اور یہ معلوم ہو کہ آزادی کی بہار
دونوں فرقوں کی ملی جلی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہر دو فرقے کے
درمیان یہ بد دیانتی اور احسان فراموشی نہیں ہونی چاہیے کہ :

ع جب بہار آئی تو کہتے ہیں کہ تیرا کام نہیں

(۲) اس پر نظر رہے کہ تدبیر پر تقدیر غالب آئی اور ہندوستان
منقسم ہو گیا۔ اب اس تقسیم پر بحث، طعن و تشنیع اور ایک دوسرے
پر الزام تراشی فضول اور بے کار ہے۔ دنیا کے نقشے میں ہندوستان
کا اب جو حصہ اور علاقہ ہے اس پر یہاں کے تمام باشندوں کا حق
ہے۔ سب مل کر اپنے اس حق کا پاس و لحاظ رکھیں۔ اور اشتراک عمل
اور باہمی تعاون سے اپنے ملک کی شان بان کو بڑھائیں، ہندوستان

اپنی کشادہ دامنی اور اعلیٰ ظرفی کے لئے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ اس سے قریب ہونے والے کو نہ وہ دور کرتا ہے نہ اپنا دامن چھڑاتا ہے، بلکہ پریقین لب ولہجہ میں نہایت شفقت کے ساتھ کہتا آرہا ہے:

ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

(۳) ہندوستان کے ہندو راجا اور مسلم بادشاہ دونوں انسان تھے، انسان اور وہ بھی صاحبِ اقتدار ہو، اس کی زندگی کوتاہیوں سے کیوں کر خالی ہوسکتی ہے؟ اس لئے کسی راجا یا بادشاہ کے ہر قول وعمل کو "مذہب" کی سند حاصل نہیں ہوسکتی، نہ ہی اس کے کسی "ذاتی عمل" کو راجا یا بادشاہ کے ہم مذہب تمام دوسرے افراد کا "عمل" قرار دیا جاسکتا ہے۔ عقل، قانون، اخلاق اور مذہب کے اعتبار سے جو غلطی ہے، بہرحال وہ غلطی ہے۔ ایسی کسی غلطی کا ذمہ دار غلطی کرنے والے کے علاوہ دوسرے کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اگر اس اصولی بات پر ہماری نظر رہے تو ہندو اور مسلمان کے درمیان پائی جانے والی نہ معلوم کتنی غلط فہمیوں کا پردہ چاک ہوجائے اور صحیح اور غلط تاریخ نے تعصب اور نفرت کی جو دیوار کھڑی کی ہے وہ از خود منہدم ہوجائے۔ جس پس منظر میں یہ بات کہی جارہی ہے، غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی۔ اس سلسلے میں قرآنِ حکیم کی ایک حکیمانہ آیت سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے "یہ ایک جماعت ہے جو گذر چکی، ان کے آگے ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے آگے تمہارا کیا ہوا، اور وہ جو کچھ کرتے رہے، اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی۔" (البقرہ، آیت ۱۳۴)

(۴) راجاؤں اور بادشاہوں کی تاریخ سے ایسے واقعات یکجا اور جمع کیے جائیں جن سے بلا لحاظ مذہب و ملت، عدل و انصاف رواداری اور حسن سلوک کا اظہار ہوتا ہو اور نفرت کی بجائے محبت کے جذبات اُبھرتے ہوں۔

(۵) تمام مذاہب میں انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی "حرمت" کو تسلیم کیا گیا ہے اور صداقت، سچائی، خیر خواہی، انصاف خدمتِ خلق کی تلقین اور اذیت رسانی، ظلم و زیادتی اور بربریت سے احتراز کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایسی تعلیمات پر مشتمل ایک "مجموعہ" بڑی تعداد میں مختلف زبانوں میں طبع کرا کے عام لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس موقع پر اس حقیقت کو خوب اچھی طرح ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ تصادم انسانی ہوا و ہوس اور مفاداتِ حاصلہ کے درمیان ہمیشہ سے ہوتا آرہا ہے مگر حقیقی مذاہب کے درمیان کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہے۔ اقبالؔ نے یہ کہہ کر صرف "شاعری" نہیں کی ہے بلکہ اس "حقیقت" کو اپنے انداز اور الفاظ میں بڑی عمدگی کے ساتھ سمجھایا ہے کہ:

ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

(۶) اسلام اور ہندو دھرم میں انسانی جان و مال کو جو "احترام" دیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ قرآن میں ہے "ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے" (بنی اسرائیل: ۶۹) "کسی جان کو بغیر قصور کے ہلاک نہ کیا جائے" (بنی اسرائیل: ۳۲) "ایک جان کا ہلاک کرنے والا پوری انسانیت کا قاتل ہے" (المائدہ: ۲۲)

"آپس میں ایک دوسرے کا مال حرام طریقہ پر نہ کھاؤ" (البقرہ : ۱۸۸)
پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں " ہر انسان کو بھائی سمجھو"۔ " میں گواہ ہوں کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں اور اس کی برائیوں سے محفوظ نہ رہے"۔ "تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے"۔

یجر وید کے چالیسویں ادھیائے کے پہلے منتر میں کہا گیا ہے :
" اس جگت میں جو کچھ ہے وہ سب ایشور کا ہے، اس لئے تیاگ (ایثار وقربانی) سے اپنی دولت کو تقسیم کر کے اسے استعمال کرو، یہ سب دولت بھگوان کی ہے، تمہاری نہیں"۔ اتھروید کہتا ہے " تم کو ایک دوسرے کی بھلائی اس طرح کرنی چاہیۓ جس طرح گائے اپنے نئے پیدا ہوئے بچہ کی کرتی ہے"۔ مہا بھارت کہتی ہے : " جس طرح باپ کا دل مہر ومحبت سے بھرپور ہوتا ہے، سادھو پرش (درویش اور عالم) اسی طرح محبت کا پیکر ہوتا ہے"۔ بھاگوت پران کہتا ہے کہ " اس دنیا کی سب وستوؤں کو اور ساری مخلوق کو اس طرح پیار کر جس طرح ایک باپ اپنے بچوں کو پیار کرتا ہے۔

(۷) مذہبی پیشواؤں، قائدین اور مصلحین کے ایسے مضامین اور ملفوظات کی اشاعت عمل میں لائی جائے جس سے باہمی منافرت کم ہو، آپسی محبت پروان چڑھے اور مذہبی رواداری کا جذبہ فروغ پائے، تاہم مذہبی رواداری کے واقعات کچھ اس طرح نہ بیان کیے جائیں جس سے " وحدتِ ادیان" اور " دینِ الٰہی" کا تصور ابھرے۔ اس لئے کہ پچھلے زمانے میں یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکی ہے اور

تاریخ اسے رد کر چکی ہے، ہر مذہب کی اپنی شناخت اور اسکی مستقل حیثیت ہے جس کی بقار فطری اور قدرتی ہے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے "مذہبی رواداری" کے واقعات کا تذکرہ ہی دراصل اپنے مذہب اور دین دھرم کے ساتھ انصاف ہے، تاہم اگر کوئی دین دعوتی ہو تو یہ دعوت حکیمانہ اور مفاہمانہ انداز میں ہو۔

(۸) کسی مذہبی کتاب کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے، یا ظاہر بین نگاہ میں وہ بات عدل وانصاف، انسانی بھائی چارگی اور رواداری کے خلاف معلوم ہو تو بطور خود معنی ومفہوم متعین کرنے کے، مذہبی علمار کی طرف رجوع کیا جائے اور اس سلسلہ میں انہیں کی تفہیم وتشریح کو صحیح اور معتبر مانا جائے، اس حقیقت پسندانہ طرز عمل سے بہت سارے شکوک وشبہات رفع ہو سکتے ہیں اور یہ تعمیری ذہن بن سکتا ہے کہ ایسی کسی بات کو تاریخی پس منظر اور سیاق وسباق کو سامنے رکھے بغیر حقیقی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

(۹) دعوت وتبلیغ کی آزادی سے ضرور فائدہ اٹھایا جائے مگر اس میں نہ جبر واکراہ ہو، اور نہ ہی کسی مذہب اور اس کے پیشوا کی اہانت وتوہین، اور نہ کسی کے "معبود" (جس کی پرستش کی جائے) کو بُرا بھلا کہا جائے۔ قرآنِ حکیم میں اس اہم ترین اصول کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ "مسلمانو! یہ لوگ خدا کے علاوہ جن ہستیوں کو پکارتے ہیں، انہیں برا نہ کہنا تاکہ وہ ضد میں آکر خدائے برحق کو بُرا نہ کہنے لگیں بغیر علم کے" (الانعام: ۱۰۹) اور یہ بھی کہ "دین میں اکراہ اور جبر نہیں ہے" (البقرہ: ۲۵۶)

(۱۰) عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں کے تقدس کو ملحوظ رکھا جائے اور ضد اور نفرت میں کوئی ایسا عمل نہ کیا جائے جس سے اس کے آئینۂ تقدس پر بال آتا ہو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کے تقدس سے کھیلنے والوں کا انجام بڑا عبرتناک ہوا ہے اور اس طرح کی کی ہوئی برائی یا سازش کے جال میں خود برائی یا سازش کرنے والا ایک نہ ایک دن ضرور پھنس جاتا ہے اور بعد میں دیدۂ عبرت نگاہ کیلئے عبرت کا سامان بن جاتا ہے۔

(۱۱) "یومِ آزادی" (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء) کو ہندوستان کی تاریخ میں اہم موڑ حاصل ہے۔ اس دن جو عبادت گاہ جیسی تھی وہی حیثیت اس کی برقرار رکھی جائے۔ یہ فارمولہ ہندوستان کے بعض بزرگ سیاستداں بہت پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اَب کسی نئے فارمولے کی تلاش، منزل کو دور کرنے، پیچیدگیاں بڑھانے اور تضییعِ اوقات کے مماثل ہے۔ اس وقت کسی عبادت گاہ کے مسئلہ کو از سرِ نو ابھارنا اور اپنے تئیں ایسی فہرست مرتب کر کے شائع کرنا جس میں بعض مسجدوں اور مندروں کی موجودہ حیثیت کو چیلنج کر کے سابق میں اسے ایک دوسرے کی جگہ پر بتانا، یہ ملک کی خدمت نہیں، بد خدمتی ہے اور یہ جذبہ مذہبی نہیں خالص سیاسی ہے اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ عقلِ صحیح اور فہمِ سلیم سے کام لیا جائے اور شیخ سعدی کی اس حکیمانہ باتوں پر توجہ دی جائے کہ "فتنہ انگیز سچ سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔"

(۱۲) حساس، نازک اور جذباتی مسئلہ کو اس طرح بیان نہ کیا

جائے جس سے فریق ثانی کے جذبات بھڑکیں اور آمادۂ پیکار بن جائے۔ اشتعال انگیز کیسٹس، کٹ آؤٹس، تصاویر، تقاریر اور بیانات پر بھی پابندی ہونی چاہیئے۔ اس کے برخلاف بھائی چارگی اور آپسی ہمدردی کے واقعات کی تشہیر زیادہ سے زیادہ کرنی چاہیئے۔

(۱۳) جو لوگ غنڈہ گردی، دہشت گردی، اشتعال انگیزی، فتنہ پروری اور قتل و غارت گری میں ملوث ہوں۔ ان کو بے نقاب کیا جائے۔ ایسے مجرمین کے لیئے "خصوصی عدالت" ہو جس میں ان پر مقدمہ چلایا جائے اور انہیں عبرت ناک سزا دی جائے۔ ایسے لوگوں کی سزائیں نرمی یا چھوٹ کا مطلب جرم میں شریک ہونا ہے، اور حاکم، منصف اور محافظ ہی اگر جرم پر پردہ ڈالے یا وہ مجرم بن جائے تو ایسے معاشرے اور ماحول کا خدا ہی حافظ ہے۔

(۱۴) کسی ملک کی "اقلیت" کے لیئے اس کی سب سے بڑی ضرورت جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کی سب سے بڑی ذمہ داری "اکثریت" پر عائد ہوتی ہے، اگر خلوصِ نیت کے ساتھ اکثریت اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو اور مقابلہ آرائی اور نیچا دکھانے کی سیاست سے بالاتر ہو تو ملک کی فضا پُر امن اور حالات نارمل رہیں گے۔ بصورتِ دیگر فرقہ وارانہ کشیدگی کا لازمی نتیجہ سامنے آئے گا اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔

(۱۵) ایسے کسی ملک میں اقلیتی طبقے پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی "تہذیبی شناخت" کو باقی رکھتے ہوئے اکثریتی طبقے

سے میل جول، انسانی ہمدردی اور رواداری کا سلسلہ قائم رکھے اور اپنی اعلیٰ تعلیم، فنی مہارت، کارکردگی کی صلاحیت، کڑی محنت، جذبۂ خدمت، صالحیت اور ہمہ جہتی نافعیت کے اعتبارات سے ملک کی ناگزیر ضرورت بن جائے۔

(۱۶) ایک انسان ہونے کے ناطے ہر فرقے کے لوگوں کی "بہتری" کا کام کرنا چاہیے۔ تاہم اگر کوئی شخص اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب لوگوں کے رفاہی اور فلاحی کام میں سرگرم ہے تو اس کا مطلب "فرقہ پرستی" نہیں ہے۔

(۱۷) نصابی کتابوں میں جو مواد خلافِ واقعہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مغائر ہے اسے فوراً حذف کر دیا جائے۔ تاریخی حیثیت سے سرکاری نصابی کتب میں کسی مذہبی، تاریخی شخصیت یا مسئلہ پر مضمون درکار ہو تو یہ مضمون اس مذہب کے مستند اور معروف صاحبِ علم و قلم سے لکھایا جائے تاکہ باتیں مستند آئیں اور دوسرے کسی گوشہ سے اعتراض کا موقع نہ رہے۔

(۱۸) امن، بھائی چارگی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام اور "پیامِ انسانیت" کے لئے مستقل اور مؤثر کوئی عوامی تنظیم ہونی چاہیے جس میں ہر فرقہ کی نمائندگی ہو۔ اس تنظیم کو قانونی حیثیت بھی دی جائے تاکہ اہم اور نازک مسئلوں میں اس کی رائے کی اہمیت کو حکومت، عدالت اور پولیس محسوس کرے۔ یہ تنظیم ملک گیر ہو اور اس کے فریضہ میں ہو کہ فرقہ وارانہ حالات پر کڑی نظر رکھ کر مناسب کارروائی کرتی رہے۔ بستی اور محلے کی سطح

پر جو امن کمیٹیاں قائم کی جاتی ہیں انہیں بھی فعال بنا کر یہ کام ان سے مؤثر طریقہ پر لیا جا سکتا ہے۔

(۱۹) مسلمانوں، ہندوؤں اور دیگر فرقوں کے عام لوگوں کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ ان کے نوجوانوں، طلبہ اور اساتذہ کو مختلف انداز سے جمع کرکے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے برکات اور فرقہ پرستی کے نقصانات سے آگاہ کرتے رہنا چاہیئے اور یہ بتانے رہنا چاہیئے کہ تعمیری رجحانات کے فائدے اور تخریبی سرگرمیوں کے نقصانات کیا ہیں؟ فساد یا فساد جیسے حالات میں کارنر میٹنگ، بین فرقہ جاتی "امن مارچ"، اور مختلف اجتماعات کے انعقاد کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے نمایاں کام کرنیوالوں کو انعام بھی دیا جائے۔

(۲۰) ڈاکٹر، انجینئر، وکلاء اور اساتذہ خصوصیت کے ساتھ اپنے پیشہ کو ہر تعصب اور تنگ نظری سے پاک رکھیں اور عمومی فلاح وبہبود کے کام اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مساعی میں پیش پیش رہیں، نیز ہندوستانی باشندوں میں یہاں کے جمہوری نظام کی اہمیت اور عدلیہ کی برتری کا احساس شدت سے ہونا چاہیئے

(۲۱) کسی بھی ملک میں عدلیہ پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے کی نظر دولت، شخصیت اور فرقہ پر نہیں ہوتی ہے، بلکہ ہر حال میں انصاف پر ہوتی ہے، عدلیہ کا وقار اسی بات میں پوشیدہ ہے۔ اہل عدلیہ کا اس حقیقت پر نگاہ رکھنے کا مطلب فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے "بہترین زمین

فراہم کرنا ہے۔

(۲۲) آج کی دنیا میں "ذرائع ابلاغ" (ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات وغیرہ) کی بڑی اہمیت ہے۔ اچھا اور خراب ذہن بنانے میں یہ نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ ذرائع جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں، انہیں باریک بینی کے ساتھ اس پر نظر رکھنی ہوگی کہ کسی پروگرام، مواد اور اس کے انداز اور ترتیب سے تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کو ہوا تو نہیں مل رہی ہے اور اس کے نتائج کیا برآمد ہونے والے ہیں؟۔

(۲۳) صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت حقیقت پسندی دیانت داری اور وسیع النظری ہے لیکن ہندوستان کے اکثر جرائد اور اخبارات ان صفات سے محروم ہیں اور وہ تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے شکار ہیں، اس سلسلے میں کوئی اصول اور ضابطۂ اخلاق ہونا چاہیئے تاکہ صحافت سے تعمیری کام اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے استحکام میں بھرپور مدد مل سکے۔

(۲۴) پولیس کا محکمہ عمومی نظم و نسق پر کنٹرول کے لئے ہے، اس کی یہ ذمہ داری بڑی نازک اور حساس ہے، جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ کی اصطلاح میں سوچنا، آپس میں عصبیت رکھنا، مظلوم اور بے قصور افراد کو مختلف انداز سے پریشان کرنا، اپنے پیشہ اور منصب کے ساتھ سب سے بڑی غداری اور خیانت ہے، اسی طرح مفاداتِ حاصلہ کے لئے پولیس پر غیر ضروری سیاسی دباؤ اور سفارش سے بھی نظم و نسق کی حالت بگڑتی اور ابتری پھیلتی ہے، اس سلسلے

میں یہ بھی ضروری ہے کہ پولیس میں بھرتی کے لئے کوئی "ضابطۂ اخلاق" ہو اور اگر پہلے سے موجود ہے تو اس پر سختی کے ساتھ عمل کیا جائے۔

(۲۵) فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے ایک عرصہ سے بعض قائدین کی جانب سے بین فرقہ جاتی" امن فورس" کے قیام، پولیس اور فورس میں فرقہ کی مناسب نمائندگی اور تشدد اور فساد کی صورت میں" اجتماعی جرمانہ" کی تجاویز پیش کی جاتی رہی ہیں لیکن ہوا یہ کہ :

ع عرضی پہنچ کر دفترِ شاہی میں رہ گئی

اس طرح کی تجاویز پر بعجلتِ ممکنہ عمل کرنے کی ضرورت ہے اس پر بھی نظر رہے کہ ہندوستان میں بالفرض کسی ایک ہی فرقے کے لوگ ہوں تو ان کے درمیان تو اور بھی بھیانک تصادم کا خطرہ ہے اس لئے تمام فرقوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے ہی میں اجتماعی فائدہ ہے۔ کاش اس نکتہ پر خوب اچھی طرح غور کیا جاتا۔

(۲۶) پولیس اور فوج میں خصوصیت کے ساتھ ڈسپلن اور نظم و ضبط کی پابندی ہونی چاہیئے لیکن اس میں شامل کسی فرقہ کے کسی آدمی کی جانب سے ڈسپلن شکنی یا جذباتیت کا کوئی واقعہ پیش آئے تو اس فرقہ کے تمام افراد کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھنا اور دوہرا معیار اور پیمانہ وضع کرنا یہ عدل وانصاف کے خلاف بات ہے، ہر فرقے اور ہر طبقے میں اچھے برے اور فرض شناش اور فرض ناشناس ہوتے ہیں۔ دانا کا کام ہے کہ پھول کو چُنے اور کانٹوں کو چھوڑ دے اور اپنے حلقے میں بے چینی کے اسباب پیدا نہ ہونے دے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حکومت اور پولیس دیانتداری کے ساتھ فساد

اور انتشار نہ چاہے تو نہیں ہو سکتا۔ بار بار اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔

(۲۷) مغربی جمہوریت اور ہندوستانی جمہوریت میں بہت بڑا فرق ہے۔ مغرب میں عام طور پر انتخاب میں اشخاص اور افراد کی گذشتہ خدمات، تعلیمی لیاقت اور سیاسی بصیرت وغیرہ پر نظر رکھی جاتی ہے، جب کہ انتخاب میں ہندوستانی باشندوں کا یہ مزاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں جو افراد منتخب ہو کر آتے ہیں، ان میں سے اکثر کو اپنی رکنیت، شہرت، دولت، منصب و اقتدار اور اقربا نوازی سے دلچسپی ہوتی ہے اور دلکش انتخابی منشور کے بعد ملک و قوم کی خدمات اور ان کی ترقی کا خیال انہیں نہیں آتا، اور نہ ہی صحیح اصول اور بنیادوں پر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے وہ کام کرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس وہ بسا اوقات فرقہ واریت کا زہر گھولنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

سوچئے کہ کس قدر گندی، قابلِ نفرت اور لائقِ مذمت ہے وہ سیاست کہ جس میں لوگوں کی گردن کو پل بنا کر اقتدار، عہدہ اور کرسی تک پہنچا جاتا یا اسے باقی رکھا جاتا ہے اور اپنی "انا" کی تسکین کی خاطر وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جس سے جنگل کے درندوں اور پھاڑ کھانے والے جانوروں کو بھی شرم آئے۔

(۲۸) ہندوستان کے حکمران، نظم و نسق کے ذمہ داران، صحافی، دانشور اور عوام سب کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کے اس اہم حقیقت اور نکتہ کو فراموش نہ کریں کہ کسی ملک میں اگر کسی قوم کو مسلسل دبایا اور کچلا گیا ہے اور "حالت جنگ" جیسی کیفیت میں دھکیلا گیا

ہے تو اس میں بغاوت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوئے ہیں اور یہ جذبات ہمیشہ ہر دور میں قوم و ملک کے لئے مختلف اعتبارات سے مضر بلکہ مہلک ثابت ہوئے ہیں اور بعد میں ان پر قابو پانا آسان نہیں رہا ہے۔ اس وقت ہندوستانی باشندوں کی فراست اور دانشمندی کا "امتحان" ہے کہ وہ کس قدر اس تاریخی حقیقت پر دھیان دیتے ہیں اور وہ صورتِ حال کو بناتے ہیں یا بگاڑتے ہیں ——— ؟

ع فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

(۲۹) ہندوستان میں اچھے ہندو اور اچھے مسلمان کی بہت بڑی تعداد ہے، فساد تو دراصل "سیاسی استحصال" اور "غنڈہ گردی" کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اچھے ہندو اور اچھے مسلمان اپنے اچھے احساسات، اچھے خیالات اور اچھے نظریات کے ساتھ ہر طرح کے "بھید بھاؤ" سے بالاتر ہو کر آگے آئیں اور پوری قوت کے ساتھ منظم ہو کر ایسی کوئی ھمہ گیر تحریک چلائیں جس سے فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے افراد اور غیر سماجی عناصر کی حوصلہ شکنی ہو، قومی یکجہتی اور قومی اتحاد کا جذبہ فروغ پائے۔ ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت و آبرو کے محافظ اور نگہبان و پاسبان بن جائیں۔ ذہن و دماغ میں یہ حقیقت رچ بس جائے کہ کسی مسلمان یا ہندو کی جان جاتی یا ان میں سے کسی کی دُکان لوٹی یا جلائی جاتی ہے تو اس سے "انسانیت" کا سر شرم سے نیچے جھکتا ہے! اور اس صورت میں کسی مسلمان یا ہندو کا

نقصان صرف اس کا نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ملک کا "اجتماعی نقصان" ہے۔ وہ ملک جس میں سینکڑوں برس سے ہم دونوں مل کر رہتے آئے ہیں اور یہاں ایک دوسرے کی اچھی اور بہتر چیزوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس ملک کے گیسو کو سنوارنے، اسے آگے بڑھانے اور ترقی دینے میں اور اپنی گردن سے طوقِ غلامی کو اتارنے میں ہم سب نے برابر کا حصہ ادا کیا ہے۔ اگر ہم نے اس حقیقت کو نہیں اپنایا تو ہمارا ملک جو سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت اور کمپیوٹر کی دنیا میں جو اہم اور قابلِ رشک پیش رفت کر رہا ہے، اس کی یہ پیش رفتاری رک جائے گی، اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں سرِ فہرست جو اس کا نام آ رہا ہے اس کی نیک نامی متأثر ہو جائے گی۔ پھر یہ بھی کہ ہمارا آپسی انتشار ہمیں اندرونی طور پر کمزور کر دے گا اور ہماری اندرونی کمزوری سے ہمارے ملک کے دشمنوں کا حوصلہ بڑھے گا۔ اس لئے کہ اندر کی طاقت ہی کسی فرد، جماعت، معاشرہ، سوسائٹی، خاندان اور ملک کو طاقت ور بناتی ہے اور اندر کی کمزوری ہی ان سب کو کمزور کرتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نزلہ عضوِ ضعیف ہی پر گرتا ہے۔

(۳۰) فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے آخری ضروری بات یہ ہے کہ دونوں فرقوں کے لوگ افواہ پر کان نہ دھریں۔ کسی بھی نزاعی مسئلہ میں دو بدو بات چیت، مفاہمت، مصالحت اور تحقیقِ حال کے طریقوں کو اپنائیں۔ ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی سے

باز آئیں۔ صبر و ضبط اور تحمل و برداشت کی قوت کو بڑھائیں، ملک و قوم کے دشمنوں، امن وسکون کے غارت گروں اور سماج و سوسائٹی کے غنڈوں سے پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کرکے ان کے ناپاک عزائم اور مذموم حوصلوں کو پست کریں۔ نادانی سے "کچھ" ہو جائے تو بہت جلد شرمساری کے ساتھ گلے مل کر گلے کو دور کرلیں اور شاعر مشرق حکیم و دانا اقبال کے "قومی ترانہ" کے اس شعر کو نگاہ کی راہ سے دل میں اتار لیں کہ:

ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

انسان کی تلاش

بابائے قوم آنجہانی گاندھی جی (۱۸۶۹۔۱۹۴۸ء) نے اپنی کتاب "تلاشِ حق" میں ایک جگہ بہت تفصیل سے ان عناصر اور عوامل کا تذکرہ کیا ہے، جن سے ان کی شخصیت بنی اور ان کے ذہن و فکر کی تعمیر ہوئی ہے اس ذیل میں انہوں نے بعض گجراتی اشعار کا بھی تذکرہ کیا ہے جن سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے اور ان کے مطالعہ سے انہوں نے جانا کہ اخلاق اور انسانیت کیا ہے، اور ایک با اخلاق اور اچھا انسان کیسا ہوتا ہے؟

ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

جو کوئی تجھ کو پانی پلائے اس کو اچھا کھانا کھلا
جو کوئی تجھ سے ہنس کر بولے اسکے آگے سر کو جھکا
تانبے کا جو پیسہ دے تو اس کو کیسۂ زر دے دے
جان بچائے جو تیری، تو اس کی خاطر سر دیدے
ہے یہ قول حکیموں کا اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں
ایک کے بدلے دس دیتے ہیں نیکی کا دم بھرتے ہیں

پر جو سچے داتا ہیں ہے ان کا سب سے ایک سلوک
پاپ کے بدلے پُن کرنا اور بدے سے کرنا نیک سلوک

اشعار کا اثر

گاندھی جی نے لکھا ہے کہ ان اشعار نے میرے دل و دماغ کو مسخر کر لیا، ان کے مطالعہ سے اس عقیدہ نے میرے دل میں گہری جڑ پکڑ لی کہ اخلاق ساری زندگی کی بنیاد اور آدمیت کا کمال ہے، ان اشعار میں بدی کے بدلے نیکی کرنے کی جو تلقین ہے وہ میرے لئے شمع ہدایت بن گئی، اس کا میرے دل میں اتنا جوش تھا کہ میں نے اس کے مطابق عملی تجربے شروع کر دیئے، جس سے مجھے خاص قسم کی طمانیت و مسرت حاصل ہوتی رہی۔ (تلاشِ حق، ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صفحہ: ۶۲)

لیکن آہ! آج انسانوں سے بھری دنیا میں ایسے انسان نہیں ملتے ہیں جو اپنی تہذیب و شرافت، اخلاق و مروت، نگہ کی بلندی، سخن کی دلنوازی، ہمدردی و غمخواری اور خلوص و وفاداری میں اونچی قدروں کا نمونہ پیش کر کے طمانیت و مسرت حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، اگر ہیں بھی تو ان کی تعداد بہت کم ہے اور ایسے کمیاب انسان ہی سے شاید دنیا باقی اور انسانیت زندہ ہے۔

سبق آموز حکایت

اس سلسلہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ (۶۷۲-۶۰۴ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مثنوی" میں ایک بڑی دلچسپ اور سبق آموز

حکایت لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص دن کی روشنی میں چراغ ہاتھ میں لئے ہوئے بازار میں پھر رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر ایک دوسرے شخص نے اس سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا کہ دن کی روشنی میں تجھے چراغ کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اسے اپنے ہاتھ میں لئے یوں بازار میں کس لئے تو گشت کر رہا ہے؟ اس آدمی نے جواب دیا مجھے انسان کی تلاش ہے، میں اس بازار میں اِدھر اُدھر اور یہاں وہاں اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں، سوال کرنے والے نے اس آدمی سے کہا کہ مجھے اس جواب پر سخت حیرت ہے، انسانوں سے تو یہ پورا بازار بھرا پڑا ہے اور تمہیں یہاں کوئی انسان نظر نہیں آتا ــــــــــ اس مردِ دانا، حق آگاہ نے کہا:

"اس بازار میں کوئی مرد نہیں ہے، صرف صورت مرد کی سی ہے، یہ سب روٹی، حرص و لالچ اور مختلف نفسانی خواہشات کے مارے ہوئے ہیں، اے مخاطب! اس بازار میں تو جن انسانوں کو دیکھتا ہے، یہ سب خصائلِ انسانیت اور آدمیت کے خلاف ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں، صرف آدمیت کے غلاف میں نظر آرہے ہیں، آدمی کے لئے صفاتِ آدمیت ضروری ہیں، اگر عود جو خوشبو دار لکڑی ہے اس میں خوشبو عود کی نہ ہو تو پھر اس میں اور عام ایندھن کی لکڑیوں میں کیا فرق ہے؟ ایسے عود بے خوشبو کو بھی ایندھن کی لکڑیوں میں شمار کیا جائے گا، خوب اچھی طرح جان لو کہ آدمیت اور انسانیت گوشت اور چربی اور پوست (کھال) کا نام نہیں ہے، آدمیت ان صفات اور اخلاق و اعمال کا نام ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور اس کے بندوں

کے حقوق ادا ہوتے ہیں"۔

شیخ سعدی کا پیغام

مولانا رومی ہی کی طرح شیخ سعدی شیرازیؒ (۱۲۹۱ - ۵۸۹ھ) نے بھی اپنی مقبولِ عام کتاب "گلستاں" میں مختلف عنوان سے انسان کو انسانیت کا پیغام دیا ہے، ایک جگہ انہوں نے اپنے چند اشعار کے ذریعہ یہ بلیغ اور طاقتور تصور دیا ہے کہ تمام انسان ایک جسم کے اعضا کی طرح ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش کی اصل ایک ہے یعنی سب کے سب پانی کے قطرے اور حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا سے پیدا ہوئے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ جب جسم کا کوئی عضو کسی طرح کی تکلیف محسوس کرتا ہے تو دوسرے تمام اعضا اس کی تکلیف سے بے چین ہو جاتے ہیں، چونکہ اصل اور روح سب کی ایک ہے، اسی طرح انسان کی اصل ایک ہونے کی وجہ سے ایک انسان کا درد دوسرے انسان کے لئے اضطراب کا باعث بننا چاہیئے، اگر ایک انسان دوسرے انسان کے غم والم اور دکھ درد سے بے نیاز اور ناآشنا ہے تو اس کا نام آدمی نہیں رکھنا چاہیئے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کا درسِ انسانیت

پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۶۳۲ - ۵۷۱ء) نے ایک دفعہ خانۂ کعبہ میں کھڑے ہو کر انسانی عزت، انسانی بھائی چارہ اور انسانی مساوات کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا "خداوندا! میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں (ابوداؤد)، ایک

حدیث میں ہے کہ ایک دن صحابۂ کرامؓ کے سامنے آپؐ نے فرمایا "جنت میں رحمدل انسان داخل ہوگا. صحابہؓ نے عرض کیا حضورؐ ہم سب رحمدل ہیں، آپؐ نے فرمایا نہیں، رحمدل وہ ہے جو تمام مخلوق پر رحم کرے (کنزالعمال) ایک روایت میں ہے کہ "زمین پر بسنے والوں سے محبت اور رحمت و شفقت کا برتاؤ کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تم پر مہربان ہوگا" اپنے بندوں پر خدا کی یہی مہربانی ہے کہ ایک حدیث قدسی میں خدا نے انسان کے کھانے پینے اور دوا اور علاج وغیرہ کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتیں قرار دے کر ان کی تکمیل پر دوسرے انسانوں کو انوکھے اور نرالے انداز میں ابھارا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ "جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا وعدہ ختم ہو جاتا ہے" چنانچہ امام احمد بن حزمؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی آدمی بھوک سے مر جائے تو اس کے باشندے اس فرد کے قاتل قرار پائیں گے اور ان سے مقتول کی دیت وصول کی جائے گی، ایک حدیث میں بہترین انسان اس کو قرار دیا گیا ہے جو دوسروں کے لئے نفع بخش ہو، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر دوسروں کی کلفت اور مصیبت میں کوئی کام آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت کی کلفتوں اور مصیبتوں کو دور کرے گا، ایک روایت میں مسلمان یا معیاری انسان کی یہ تعریف کی گئی ہے، اس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسرے انسان محفوظ رہیں۔ ایک حدیث سے ظاہر ہے کہ قیامت میں نماز، روزہ حج، زکوٰۃ وغیرہ کی عبادتیں سب خطرہ میں پڑ جائیں گی، اگر کسی نے دنیا میں کسی انسان پر ظلم کیا ہے اور اس کے حقوق کو مار کھایا ہے، زمین، جائداد

اور مال وغیرہ پر اگر کسی نے ناجائز اور ظلماً قبضہ کیا یا کوئی چیز یہاں تک کہ پیلو کی مسواک ہی بلا اجازت لے لی، اس سلسلہ میں سخت وعید آئی ہے۔ ایسے لوگوں کی خدا کے پاس زبردست پکڑ ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی میں بھی انسانیت نواز ذہن وفکر کے لئے درس وپیغام ہے کہ "تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں، جبتک وہ جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہے، وہی اپنے بھائی کے لئے بھی نہ پسند کرے"۔

اسلام میں مذہبی اور انسانی حقوق کی رعایت

قرآن حکیم میں دعوت وتبلیغ کی آزادی دیتے ہوئے دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت اور مذہبی پیشواؤں کے احترام کی تعلیم دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ تم دوسروں کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی نادانی اور جہالت سے تمہارے "خدا" کو جس کی تم پرستش کرتے ہو، برا بھلا کہے، قرآن ہی میں ایک جگہ فتنہ وفساد برپا کرنے کو جس سے انسان کا امن وامان غارت ہو جائے، اور اس سے سکون واطمینان کی دولت چھن جائے قتل سے زیادہ سنگین جرم قرار دیا گیا ہے، ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی نے کسی انسان کو ظالمانہ طور پر قتل کیا ہے، تو گویا پوری انسانیت کو اس نے قتل کیا، اور اس سے باز رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پوری انسان کی زندگی کو عزیز رکھا۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے ان سات انسانی حقوق کی رعایت ہر ایک کو کرنی چاہیئے (۱) آدمیت اور انسانیت کا احترام (۲) انسانی جان کی حفاظت (۳) انسانی مال کی حفاظت (۴) انسانی عزت وآبرو

کی حفاظت، (۵) مذہب اور رائے کی آزادی کا تحفظ (۶) ضروریات زندگی کا انتظام اور کفالت (۷) خواتین کے ناموس کا تحفظ ——— یہ وہ حقوق ہیں جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانی برادری کو عطا کئے ہیں۔ علامہ اقبال (۱۸۷۷ء–۱۹۳۸ء) نے اسلام کے اس تصور انسانی کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے: ؎

آدمیت، احترامِ آدمی　　باخبر شو از مقامِ آدمی

(یعنی آدمیت، آدمی کے احترام کا نام ہے، اس مقام آدمی سے باخبر رہو)۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان کے بلند و بالا مقام کی طرف جو ان سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کی روح تقریباً تمام مذاہب میں موجود ہے، کیونکہ کوئی بھی مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا اور ہر ایک میں احترامِ انسانیت کی تعلیم دی گئی ہے، اسلام میں تو یہ تعلیم سب سے واضح شکل میں ملتی ہے، لیکن آہ! یہ بات کیسے اور کیونکر لکھی جائے کہ وہ انسان جو تمام مخلوقات میں معزز و مکرم ہے (ولقد کرمنا بنی آدم) زمین میں خدا کا نائب ہے (انی جاعل فی الارض خلیفة) اور جسے خالقِ کائنات نے بہترین ساخت پر پیدا فرمایا ہے (لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم)، وہ جب گراوٹ پر اترتا ہے تو تمام مخلوق کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور بسا اوقات اس کی وحشت اور درندگی سے شیر اور بھیڑیئے بھی شرما جاتے ہیں۔

ع

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے۔

آج کی ایک اہم ضرورت

آج کی چپقلش، کرائسس اور مختلف تعصبات سے بھری دنیا میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ انسان خواہ اس کا تعلق کسی مذہب و مسلک سے ہو، رنگ و نسل کے اعتبار سے کیسا ہی ہو، کوئی زبان بولنے والا ہو، کہیں کا رہنے والا ہو، تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جیسا کچھ اختلاف ہو، کسی جماعت، پارٹی اور کسی منصب و عہدہ سے وابستہ ہو، وہ سب سے پہلے اپنے "انسان" ہونے کو جانے اور پہچانے، اس کی حقیقت اور حیثیت پر نظر کرے، وہ یہ سمجھے کہ کسی انسان کی تکلیف میری تکلیف ہے، کسی انسان کا قتل میرا قتل ہے، کسی انسان کا گھر جل رہا ہے اور دکان تباہ ہو رہی ہے تو وہ میرا ہی گھر اور میری ہی دکان ہے، کسی عورت کا سہاگ لٹ رہا ہے اور کوئی بچہ یتیم ہو رہا ہے تو یہ حادثہ میرے اپنے گھر کا ہے، خنجر کسی پر چل رہا ہو اور تڑپ یہ رہا ہو، ان اعتبارات سے انسان کا انسان بننا، ہمارے مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی کے بہت سارے امراض کا واحد علاج ہے، اس سے لاپرواہی اور غفلت ہی نے ہمارے لئے بہت سارے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں، اور اسی وجہ سے انسان کی بستی اور آبادی میں استحصال کی گرم بازاریاں ہیں جنہیں دیکھ کر شاعر چیخ اٹھتا ہے:

کس نے میرے چند تنکوں کو جلانے کے لئے
برق کی زد میں گلستاں کے گلستاں رکھ دیئے

جگر مراد آبادی نے بھی "مسئلۂ انسانیت" پر اپنے ان دو شعروں میں نرالے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

جہلِ خرد نے یہ دن دکھائے گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے
کارِ زمانہ جتنا جتنا بنتا جائے، بگڑتا جائے

جگرؔ ہی کہتے ہیں : ؎

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوص ایماں، خلوص نیت
انہیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

ایک آدمی اپنے اندر بہت سے علمی کمالات اور فنی خوبیاں رکھتا ہے، مگر اس آدمی کے اندر "انسانیت" نہیں ہوتی، اور بستی، شہر اور محلہ والے اس کے برتاؤ اور اخلاق سے خوش نہیں رہتے ہیں۔ آدمی کے اندر آدمیت اور انسان کے اندر انسانیت ہونی چاہیئے، یہی اس کا جوہرِ اعظم ہے، خواہ قابلیت وصلاحیت کے اعتبار سے وہ قابلِ ذکر نہ ہو، اکبر الٰہ آبادی نے اس حقیقت کو اپنے ایک شعر میں نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں : ؎

اکبرؔ کی برائی اچھائی تو پوچھ محلے والوں سے
نظم انکی سنی ہے البتہ، ہاں شعر تو اچھے کہتے ہیں

سعادت حسن منٹو کی قیمتی بات

زیرِ نظر مضمون کو ختم کرتے ہوئے بے اختیار سعادت حسن منٹو کی بات یاد آرہی ہے جو ہندوستان میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ ذہنیت کے پس منظر میں خصوصیت کے ساتھ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، ان کی یہ بات ہوش وخرد اور عقل وتجربہ کا نچوڑ ہے اور اس کی رگوں میں انسانیت کا خون دوڑ رہا ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"یہ مت کہو ایک لاکھ مسلمان مرے اور ایک لاکھ ہندو مرے، یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے، ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے سمجھا ہوگا کہ ہندو دھرم ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، لیکن ہندو دھرم آج بھی ویسے ہی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، ایک لاکھ مسلمانوں کو مار کر ہندوؤں نے یہ سمجھا ہوگا کہ اسلام ختم ہوگیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی ۔"

ہم سب مل کر یہ کام کریں

انسانیت کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے کے لئے صحیفہ نگاروں شاعروں، ادیبوں، واعظوں، رہنماؤں اور دانشوروں کو اٹھنا چاہیئے اور اپنے اپنے انداز میں اس اہم فریضہ کو انجام دینا چاہیئے، خدا کے پیغمبروں اور برگزیدہ بندوں کا بھی اصل کام یہی رہا ہے، اگر یہ کام ہوتا رہا تو ایک انسان کسی انسانی اور اخلاقی سلوک اور فریضہ کو انجام دے کر ویسی ہی طمانیت و مسرت حاصل کرے گا جیسا کہ بابائے قوم گاندھی جی نے اپنے بارے میں "تلاشِ حق" میں لکھا ہے، ایسے ہی انسان کی تلاش میں مولانا رومیؒ کے "مردِ حق آگاہ" بھی دن میں چراغ لے کر نکلے تھے، اس میں کامیابی سے رزق اور امن کی نعمتیں جو ہر ملک کے لئے ہر زمانہ میں انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے سب سے بڑی اور قابلِ قدر نعمتیں رہی ہیں، ان سے بھی انسان بلا توقف اور بلا خوف و خطر اپنا اپنا حصہ پاتا رہے گا، اور پنڈت برج نرائن چکبست (۱۸۸۲ء - ۱۹۲۶ء) کے اس معنی خیز اور حقیقت آفریں شعر کی عطر بیز تعبیر ملتی رہے گی کہ

درد دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا آدمیت یہی ہے اور یہی انساں ہونا

انسانی زندگی میں غم اور خوشی۔ دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں یہاں نہ غم کو قرار ہے اور نہ ہی خوشی کو ثبات۔ اگر زمانے میں کسی چیز کو ثبات ہے تو صرف تغیر کو۔ تغیر کا عمل دوام و استقلال کے ساتھ جاری ہے شبِ تاریک کے دامن سے سحر پیدا ہوتی ہے اور دن کی روشنی کے بعد رات کی تاریکی بھی آتی ہے اور وقت خوشی کا ہو یا غم کا گذرنے کے لئے ہے، وہ گذر ہی جاتا ہے، انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے اس فلسفہ اور راز کو سمجھے اور غم ہو کہ خوشی دونوں حالتوں میں جینے کے گُر اور ہُنر کو سیکھے، اور ہر صورت میں اعتدال و توازن کے ہیرے کو ہاتھ سے جانے نہ دے، بقول اکبر الہ آبادی: ؎

لطافت کو نہ چھوڑے رنگ تیری شادی و غم کا
ہنسی آئے تو پھولوں کی جو رونا ہو تو شبنم کا

غم کو خوشی بنا، کوئی پہلو نکال کر

غم اور خوشی کے ان دو طرفہ پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے الہ آبادہی کے ایک دوسرے شاعر نجیبؔ نے حسّاس دلوں کو یہ کہتے

ہوئے مخاطب کیا ہے کہ

؎ تو ہی یہ بتا دلِ مضطرب کہ میں سمجھوں اسے کیسے معتبر
ملی جو بھی شئے ملی عارضی، نہ تو غم رہا نہ خوشی رہی

قرآن حکیم کا یہ حکیمانہ ارشاد ہے :

"جو چیز تم سے لی جا رہی ہے اس پر (اتنا) رنج نہ کرو، اور جو چیز اس نے تمہیں دی ہے اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا" (الحدید: ۲۳)

مفسرِ قرآن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں :

"تم خوب سمجھ لو کہ جو بھلائی تمہارے لئے مقدر ہے ضرور پہونچ کر رہے گی اور جو مقدر نہیں وہ کبھی ہاتھ نہیں آ سکتی جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم میں ٹھہر چکا ہے ویسا ہی ہو کر رہے گا، لہٰذا جو فائدہ کی چیز ہاتھ نہ لگے اس پر غمگین و مضطر ہو کر پریشان نہ ہو اور جو قسمت سے ہاتھ لگ جائے اس پر اکڑو اور اتراؤ نہیں بلکہ مصیبت و ناکامی کے وقت صبر و تسلیم اور راحت کے وقت شکر و تحمید سے کام لو"

غم اور خوشی کے اس فلسفہ کو نگاہ میں رکھا جائے تو حوصلہ مند اور باہمت فرد کے لئے یہ راہِ عمل طے پاتا ہے کہ غم کی کسی صورت میں وہ اپنے اوپر مایوسی اور نا امیدی کو طاری کر کے بیٹھ نہ جائے بلکہ وہ اپنی جد و جہد جاری رکھے اور شاعر کا یہ باعظمت مصرع اس کی باعزیمت زندگی کے لئے ایک پیغام بن جائے کہ

ع غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کر

تیری رضا جو ہو سو ہو

اِنسان کی زندگی میں "خوشی" کی حیثیت اتنی بلند ہے کہ اہلِ جنت جنت کی تمام تر نعمتوں کے سرفراز کئے جانے کے بعد جس سب سے "بڑی نعمت" سے نوازے جائیں گے۔ وہ ہے اللہ کی "خوشنودی" اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَر اس پر بھی نظر رہنی چاہئے کہ رنج وغم کے بوجھ سے ذہن و دماغ کو ہلکا رکھنا، انسان کی اخلاقی اور طبی ضرورت بھی ہے۔ ایسا انسان چاق وچوبند اور ہشاش و بشاش رہ کر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بغیر کسی کوتاہی سستی اور غفلت کے انجام دیتا رہے گا۔ طرح طرح کی بیماریوں سے نجات ملے گی اور عام صحت ٹھیک اور درست رہے گی۔ ملنے جلنے کا انداز بہتر رہے گا اور طبیعت و مزاج میں چڑچڑا پن اور غصہ کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ ایمان ویقین میں تازگی آئے گی اور صبر وتوکل اور تسلیم ورضا کے ساحل سے ہمکنار ہو کر اپنی زندگی میں حقیقی بندگی کا مزہ پائے گا اور پھر حضرت شاہ خاموش کی زبان میں مستانہ وار کہہ سکے گا:

در پہ ہوں تیرے آکھڑا
کیا کہوں بس خاموش ہوں

شاہ بنا گدا بنا
تیری رضا جو ہو سو ہو

خوش رہنے کا ہنر سیکھئے:-

راقم الحروف کو اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون یاد آرہا ہے جو خط کی شکل میں ان کی شاہکار اور گرانمایہ ادبی کتاب "غبار خاطر" میں ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے اس خط میں غم و خوشی کے فلسفہ پر فاضلانہ اور محققانہ بحث کی ہے اور یہ تلقین کی ہے کہ

" اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؛ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں "

"غبارِ خاطر" کا یہ نواں خط (جو ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے) پورا کا پورا پڑھنے سے متعلق ہے۔ تاہم افادۂ عام کی خاطر اس کے بعض اہم حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

" قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا، اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں، صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کریں گی، فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے

کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب اٹھتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو۔ جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو۔ جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں۔ کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے۔ پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سر و سامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہو سکتا مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے، ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے، حالانکہ اگر اسے ڈھونڈھ نکالیں تو عیش و عشرت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے ——— ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لے لیں، دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خود رَو کے فرش پر جا بیٹھیں، اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی، لیکن اگر دلِ زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلائیے اس کا بدل کہاں ڈھونڈیں

اس کی خالی جگہ بھرنے کے لئے کس چولھے کے انگارے کام دینگے؟

مجھے یہ ڈر ہے' دلِ زندہ' تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے، تیرے جینے سے

میں آپ کو بتلاؤں اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا، کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی "۔

سب سے بڑا دانشمند آدمی

مولانا آگے لکھتے ہیں " لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے کاموں کے لئے کام میں لائیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا، یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مرجایئے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیئے جس نے یہ مشکل حل کرلیا' اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا، غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا' ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے " سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے "؟ پھر جواب دیا ہے" جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے " اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے

کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیئے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیئے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں ———— زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندری ژید (ANDIRIG GIDE) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے، یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا، وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے یا یوں کہیئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیئے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ ہوکر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں :

ے افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے، یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے، اگر ایک چہرے پر غبار آجائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے، ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے، وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے، دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں، یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی، ہم جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے، ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے

اکٹھے ہو جائیں گے: ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔

فطرت کی بزم نشاط سے سبق

مولانا آزاد کے خط کا آخری حصہ یہ ہے "عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھر سکتا اتنا ہی زیادہ مذہبی فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا ——— مذہب اور روحانیات کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبعِ خنک کی (غلط طور پر) اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دینداری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں، تاہم یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے، جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے جس مرقع میں سورج کی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرہ کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہوسکتے، فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو، اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی

ہو"   (غبارِ خاطر)

ایک دلچسپ واقعہ

موضوع کی مناسبت سے مناسب ہوگا کہ حضرت خواجہ حسن نظامی کی "آپ بیتی" کا یہ دلچسپ واقعہ صفحہ (۱۲۰) بھی پڑھا جائے خواجہ صاحب لکھتے ہیں ——— ۱۹۱۱ئہ میں پورٹ سعید سے بمبئی آ رہا تھا، راستہ میں طوفان آیا اور افسرانِ جہاز نے خطرہ کا اعلان کیا، اور جان بچانے کی تدبیریں شروع کیں، میرے قریب چند عورتیں بیٹھی تھیں، وہ چیخ چیخ کر رونے پیٹنے لگیں، مجھے ہنسی آگئی، کیونکہ ان کا رونا کچھ اسی قسم کا تھا ایک عورت نے مجھ کو ہنستا دیکھ کر کہا کیا تم کو اپنے مرنے کی خبر نہیں ہے جو ہنستے ہو، میں نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ جہاز خطرہ میں ہے مگر میں ہنس کر مرنا چاہتا ہوں اور تم رو کر مرنا چاہتی ہو، مرنا دونوں کو پڑے گا، اس بے خوفی کا سبق مجھ کو دمشق میں ملا تھا، میں نے ایک بدو سردار کو ترک پولس کے ہاتھوں مقید دیکھا، وہ سردار بہت بشاش اور بے فکر معلوم ہوتا تھا، میں نے پولس سے پوچھا یہ کون ہے اور اس کا جرم کیا ہے اس نے کہا یہ مشہور ڈاکو ہے، اس نے ریل کی پٹریاں اکھاڑی تھیں اور ڈاکے بھی بہت مار چکا ہے، اب اس کو قتل کیا جائے گا، اب تو مجھے اور بھی تعجب ہوا کہ مرنے کو جاتا ہے اور خوش ہے، آخر پولس کی اجازت سے میں نے بدو سے پوچھا کہ تم خوش معلوم ہوتے ہو، شاید تم کو اپنے پھانسی پانے کی خبر نہیں ہے، بدو نے ہنس کر جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ کل دوپہر کو اس سامنے والے پل پر موت کی رسّی میں لٹکایا جاؤں گا، مگر

میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ خوشی کی ایک ساعت ہزار موتوں سے خریدی جائے تب بھی سستی ہے۔ پھر میں کئی ساعت کی خوشی کو ایک موت کے ہاتھ کیوں فروخت کروں۔ (آپ بیتی از خواجہ حسن نظامی)

جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنسی خوشی کا ایک منٹ بھی قیمتی ہے اہلِ دل اور اصحابِ حوصلہ او رہمت اس حقیقت کو اور اس حقیقت کے بطن سے ظاہر ہونے والے فیوض و برکات کو خوب جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ انفرادی سطح کے علاوہ قومی سطح پر بھی افسردگی و یاس اور ناامیدی کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور افسردگی پیدا کرنیوالے ادب کو بھی سودمند قرار نہیں دیتے، تاہم یہ واضح رہے کہ انفرادی اور سماجی زندگی کو بنانے کے لئے کیفیت اور اخلاقی حالت کو سدھارنے کے لئے "فکرِ آخرت" ضروری ہے، بقول مشہور شاعر اعجاز رحمانی:

"فکرِ آخرت سے ہمیشہ دلشاد رہنا چاہیئے"

یہاں اس کا ذکر بے جا نہیں ہوگا کہ ادب میں جن لوگوں نے امیدِ آس کا چراغ جلایا ہے ان میں ایک نمایاں اور ممتاز نام اقبالؔ کا ہے جس کی تصدیق ہر وہ شخص کرے گا جس نے ان کے ادب اور شاعری کا مطالعہ کیا ہے، ان کی شاعری کے دوسرے حصوں کو چھوڑتے ہوئے اگر صرف "جوابِ شکوہ" کا تذکرہ کیا جائے تو اس کا اختتامی بند ہر عہد کے (ہجومِ غم میں مبتلا) مسلمان کے لئے منشور قرار دیا جا سکتا ہے اور آخری مصرع میں دی گئی نوید ہر زمانے کے مسلمان (بشمول مسلمانانِ بوسنیا و

وچیچنیا، کے لئے نوید بن جاتی ہے ؎

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تیری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تیری

ماسوا اللہ کیلئے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

آیئے! اس مضمون کو علامہ اقبالؒ ہی کے اس حقیقت افروز اور معنیٰ خیز شعر پر ختم کریں ؎

شاعر کی نوا ہو کہ معنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

زندگی
مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تجربات

ہندوستان کے جن کتب خانوں کو مخطوطات اور بعض دیگر اعتبارات سے ملکی اور غیر ملکی سطح پر وقعت، عظمت، اہمیت اور شہرت حاصل ہے، ان میں "خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ" بھی شامل ہے، اس لائبریری کو بارہا دیکھنے کا موقع ملا، اور جب بھی دیکھا اس کی خوش سلیقگی اور حسنِ انتظام نے مجھے متأثر کیا، جس طرح انسانوں کی عمریں ڈھلتی ہیں، کتابوں کی عمریں بھی ڈھلتی ہیں، لیکن مستعد انسان اپنی ڈھلتی عمر کو سنبھالا دینے اور اسے اچھی اور بہتر حالت میں رکھے رہنے کے لئے حفظانِ صحت کے اصول کا لحاظ رکھتا ہے، طبیبوں سے مشورہ لیتا رہتا ہے، مضر غذاؤں اور غیر صحت مند آب وہوا سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

خدا بخش (۱۹۰۸ــ ۱۸۴۲ء) کو خدا بخشے کہ انھوں نے اپنے جذبۂ دروں اور اخلاص نیت کی بنیاد پر جو لائبریری قائم کی تھی، ظاہری اعتبار سے اس لائبریری کی حالت اس انسان سے کم نہیں ہے جو اپنی جسمانی صحت اور روحانی توانائی کا خاص خیال رکھتا ہے، خدا بخش لائبریری کی یہی وہ جسمانی صحت اور روحانی توانائی کا کرشمہ ہے کہ بہت سی کتابیں جو "پیرانہ

سالی" کی سرحدوں میں داخل ہیں مگر ان کے چہرے پر نکھار اور بہار ہے۔ گرد و غبار کا "غازہ" بھی نہیں ہے۔ اور ان کو دیکھنے سے ان کا فطری جمالیاتی پہلو نظر کے سامنے آشکارا ہوتا ہے۔ خدا بخش لائبریری کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اہلِ علم اسے ہندوستان کی "زندہ لائبریریوں" میں شمار کرتے ہیں، اس کی زندگی اور زندہ دلی ہی کی علامت ہے کہ ہر سال سالنامہ "جنرل" شائع ہوتا ہے جو بلاشبہ علم و فن کا خزینہ اور حکمت و معرفت کا گنجینہ ہوتا ہے، یہاں ہر سال مختلف موضوعات پر سمینار بھی منعقد ہوتے ہیں۔ مفید اور نادر و نایاب کتابیں بھی طبع ہوتی ہیں، نئے لوگوں کی نئی کتابیں بھی نئے رنگ اور جدید آہنگ سے منظرِ عام پر آکر دل کو سرور اور نظر کو نور بخشتی ہیں۔

خدا بخش لائبریری سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں ایک کتاب کا نام ہے "شخصیات اور واقعات، جنہوں نے مجھے متاثر کیا"
(۲۰۶) صفحات پر مشتمل کتاب کے مرتب جناب جنید احمد ہیں، یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مرتب جناب جنید احمد نے ایسی تیرہ اہم علمی اداروں شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے جنہیں متعدد شخصیات اور واقعات نے متاثر کیا ہے، ان تیرہ شخصیتوں نے ایسی شخصیات اور واقعات کا تذکرہ اپنے مخصوص دلچسپ ادبیانہ انداز میں کیا ہے۔ زیرِ تذکرہ کتاب سے متعلق مرتب کی، یہ وقیع اور بلیغ سطریں پڑھئے:-

"نئی نسل کی ذہنی تشکیل کے ذمہ دار وہ دانش ور بھی ہیں، جن کی علمی اور ادبی تحریریں ہم ذوق و شوق سے

پڑھتے ہیں اور وہ مدبر بھی جو نئی سیاسی اور سماجی ڈھانچے کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

یہ جاننے کی خواہش بڑی فطری ہے کہ خود ان لوگوں کی ذہنی تشکیل میں کن عناصر اور کیسے کیسے حالات نے حصہ لیا ہے، خود ان کی زندگی میں وہ شخصیتیں آچکی ہیں جو ان کے دل و دماغ پر لافانی نقوش چھوڑ گئی ہیں، وہ کیسی شخصیتیں تھیں اس کا جواب مختلف اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات نے ان مضامین میں دیا ہے جو آپ کے سامنے اسی کتاب کی شکل میں آرہے ہیں۔

لکھنے والوں میں پرانی وضع کے بزرگ بھی ہیں اور نئے طرز فکر کے علمبردار بھی، اور کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنہوں نے جدید و قدیم کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس اعتبار سے یہ مضامین صرف تنوع نہیں بلکہ دل چسپ اور بصیرت افروز بھی ہیں۔ ان میں نہ صرف عظیم واقعات اور حادثات اور عظیم شخصیات کا ذکر ہے بلکہ زندگی کے بعض بہت چھوٹے چھوٹے واقعات اور نہایت حقیر لوگوں کا تذکرہ بھی ہے، ان چھوٹوں اور حقیروں نے جس طرح آج کے بڑوں کو متاثر کیا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ زندگی میں چھوٹے اور بڑے کی تقسیم کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے انتہائی حقیر چیزیں بھی انتہائی اہم ہوتی ہے۔ اور اس

حقیقت کی گواہی ہمارے یہ ہر دل عزیز ادیب اور مدیر خود ہیں. آج جن کے علم و فن کا اعتراف دوسرے ممالک میں بھی کیا جارہا ہے۔

(شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا، صفحہ ۸ - ۷)

کتاب "شخصیات اور واقعات، جنہوں نے مجھے متاثر کیا"، میں جن تیرہ اہلِ علم و قلم اور اصحاب شعر و ادب کے مضامین ہیں، ان میں آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد اشرف، پنڈت سندر لال، نیاز فتحپوری، سجاد ظہیر، کرشن چندر، احمد عباس، مولانا عبد الماجد دریا بادی، سلمیٰ صدیقی، عصمت چغتائی، سردار جعفری، حمیدہ سلطان اور ڈاکٹر گیان چند شامل ہیں، فی الوقت راقم الحروف کے پیشِ نظر مولانا عبد الماجد دریا بادی کے تحریر کردہ مضمون کا آخری حصہ ہے جو نہایت اہم ہے۔ ایک انسان اپنی زندگی کے لئے اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا اور سامانِ عبرت جمع کر سکتا ہے۔

کثیر التصانیف اور "سچ"، "صدق"، اور "صدقِ جدید"، کے ایڈیٹر مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ (۱۹۷۷ - ۱۸۹۲ء) کے بارے میں اہلِ علم جانتے ہیں کہ وہ ماہر فلسفہ و نفسیات تھے، صاحب طرز ادیب تھے، نقد و تبصرہ اور طنز نگاری میں اپنی نظیر آپ تھے، زبان و بیان پر انہیں قدرت تو تھی ہی مگر اس میں ان کی ندرت کے قائل بڑے بڑے نادر روزگار بھی رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اردو اور انگریزی میں تفسیر قرآن کی سعادت بھی بخشی، ان اوصاف و کمالات کے ساتھ اسلامی حمیت، ملّی غیرت، باطنی نسبت اور

مرشد تھانویؔ .. سے ارادت کے اعتبار سے بھی اپنی ایک شناخت اور پہچان رکھتے تھے. زیرِ تذکرہ کتاب میں مولانا دریا بادی کا مضمون صفحہ (۱۸۵) سے (۱۹۲) تک ہے، گویا مضمون آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، مضمون کا آخری حصہ جو (۱۹۰) سے شروع ہوتا ہے، وہ خوب ہی نہیں خوب تر ہے، بلاشبہ ان کا یہ مضمون ان کی پچاسی (۸۵) سالہ زندگی بلکہ کہنے کی اجازت ہو تو اس پوری کتاب کا حاصل اور خلاصہ ہے۔ مولانا دریا بادی کے مضمون کا یہ حصہ اس لائق ہے کہ اس سے ہر خاص وعام فائدہ اٹھائے، اور اپنی زندگی کے لئے اسے سرمۂ بصیرت وبصارت بنائے۔ کہنے کو جملہ آٹھ باتیں ہیں مگر اس میں بچپن، جوانی، کہولت، بڑھاپا ہر زمانے کے لئے "پاٹھ" (سبق) آگیا ہے۔ اردو میں "بقامت کہتر، بقیمت بہتر" اور "دریا بکوزہ" کا محاورہ بہت عام ہے مولانا دریا بادی کی ان آٹھ باتوں میں ان اردو محاوروں کی بہترین تعبیر ملتی ہے۔ مولانا دریا بادی تحریر فرماتے ہیں :۔

> " ذاتی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں میں اتنی عمر گذار کر جو خاص خاص تجربے حاصل ہوئے، انہیں نمبروار ذیل میں درج کئے دیتا ہوں کہ شاید ان سے کسی دوسرے کو کچھ نفع حاصل ہوجائے۔

(۱) صحتِ جسمانی کا اہتمام، سارے بدنی شعبوں میں شروع ہی سے ضروری ہے، بغیر اس کا خیال کئے نادانستہ ایسی ایسی غلطیاں صادر ہوجاتی ہیں

اور ایسی ایسی بے احتیاطیوں کی عادت پڑ جاتی ہے کہ آگے چل کر تلافی بہت دشوار ہو جاتی ہے، اور سنبھلنے اور سدھرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی، آنکھ، دانت، کان، جسم کا ہر ہر عضو ایک بڑی نعمت ہے اور نعمت کا قاعدہ ہے کہ بے پروائی اور ناقدری کے بعد چھن ہی جاتی ہے۔

(۲) یہی حال دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا ہے، اگر شروع ہی سے ان کی جڑیں مضبوط نہ ہوں تو آئندہ ہمیشہ خطرے محسوس ہوتے رہیں گے اور یکسوئی اور دل جمعی، عمر کی کسی منزل پر بھی پہنچ کر مشکل ہی ہے

(۳) دنیا میں اگر کوئی بڑا اور مستقل کام انجام دے جانا ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اپنے زعم و پندار میں اپنے کو بڑا سمجھ کر اچھالنے لگئے، یہ راہ ناکامی کی ہے، کامیابی اگر مقصود ہے تو اپنے کو سب سے چھوٹا بنا کر رکھئے، دبائیے نہیں، خود دبئے، دنیا خود ہی آپ کو اپنائے گی اور آنکھوں پر بٹھائے گی، خود غرضی، خود بینی اور خود ستائی کا راستہ دین تو دین، دنیا میں بھی نقصان و خسران ہی کا ہے۔

(۴) دیانت اور سچائی کو اپنا شعار بنائے رکھئے۔ جو دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہی دھوکا کھاتا بھی ہے اور جو دوسروں کو گرانے کی فکر میں لگا رہتا ہے

وہ آخر خود ہی گرتا ہے، خواہ اس نتیجہ کے ظہور میں دیر کتنی ہی لگے۔ "خدا کی خدائی میں دیر ہے، اندھیر نہیں"، یہ مقولہ بڑے تجربے کا ہے۔

(۵) جذبات کو قابو میں رکھنے کی مشق شروع ہی سے ضروری ہے، یہ سمجھنا کہ شباب گذر جانے پر جذبات خود ہی قابو میں آجائیں گے، ایک شدید مغالطہ ہے۔

(۶) ماں کی محبت اور ماں کی خدمت کا ولولہ ایک بڑی دولت ہے، دنیا کی نعمتیں ایک طرف اور یہ ایک نعمت ایک طرف۔ اس کی قدر ایک خاص سن آجانے کے بعد ہوتی ہے۔

(۷) آخرت کا عقیدہ عقلی، منطقی، کلامی پہلوؤں سے قطعِ نظر عملی اعتبار سے بھی بڑا ہی قیمتی عقیدہ ہے، اپنے دل میں جب سے یہ عقیدہ اترا، پوری زندگی بامعنیٰ بامقصد بن گئی، اس کے قبل افلاطون اور ارسطو، کینٹ اور ہیگل، مل اور اسپنسر کو چاٹ جانے کے باوجود، یہی زندگی گاندھی جی کے پُرمعنی الفاظ میں ایک "بے پتوار کی کشتی تھی"۔

(۸) ہر معصیت، ہر نفس پرستی کا داعیہ جب تک ضعیف و خفیف رہتا ہے، عقلی دلائل روک تھام کے لئے کافی ہو جاتے ہیں، لیکن وہی جذبہ نفسانی جب طوفان کی شدت اختیار کر لیتا ہے تو عقل و استدلال کے

پیرا کھڑ جاتے ہیں اور بد ترین بد نفسی اور گندگی کے
لئے بھی عقل کو کوئی نہ کوئی حیلۂ جواز مل ہی جاتا ہے۔
اس آخری مرحلہ پر نفس سے مقاومت اور کامیاب
مقاومت (مدافعت، مقابلہ) کی قوت صرف خوفِ
خدا میں ہے، اس کے سوا کسی چیز میں نہیں۔"

(شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا، صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۲)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی ذاتی اور اجتماعی دونوں
قسم کی زندگیوں میں طویل عمر گذار کر تجرباتی حیثیت سے جو آٹھ باتیں
تحریر فرمائی ہیں، ان پر جس قدر غور کیا جائے، اسی قدر ان کی افادیت
نافعیت اور اہمیت سامنے آئے گی اور دل اور دماغ دونوں ان کے
اثرات کو قبول کرتے ہوئے عمل کے لئے راہوں کو ہموار کریں گے،
تاہم ان سطروں کو لکھتے ہوئے مجھے مولانا دریابادی کی کتاب "آپ بیتی"
یاد آرہی ہے (۴۰۳) صفحات پر مشتمل اس کتاب کو پہلی دفعہ ۱۹۷۸ء
میں مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ نے شائع کیا تھا (۵۲) ابواب
پر مشتمل یہ کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے، مولانا نے اپنی
اس "آپ بیتی" میں نجی زندگی کی بعض باتیں بھی بے تکلفی کے ساتھ
لکھ دی ہیں، شاید اس میں ان کے ماہر طبعیات اور نفسیات کا بھی
اثر ہو۔ اس کتاب کے (۴۹) واں باب کا عنوان ہے "عام نتائج و
تجرباتِ زندگی کا نچوڑ" یہ باب چھ صفحات (۳۷۶ تا ۳۸۱) پر پھیلا
ہوا ہے، اس میں بھی مولانا نے نہایت مفید اور کارآمد باتوں
کا تذکرہ کیا ہے۔ لہٰذا میں افادۂ عام کی خاطر ان باتوں کی تلخیص

پیش کی جا رہی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

"کتاب۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ کتابِ زندگی کا مشکل
ترین باب یہی ہے، ۷۵ سال کی زندگی کا خلاصہ
تجربات میں کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑا جائے؟
جی میں تو بے اختیار یہی آرہا ہے کہ داستانِ
زندگی (آہ کہ کتنی لذیذ اور آہ کہ کتنی تلخ، دونوں
ایک ہی وقت میں) کُل کی کل بغیر ایک حرف چھوڑے
دہرا دی جائے ــــــــ داستانِ زندگی کے
دہرانے میں لگتا ایسا ہے کہ جیسے زندگی خود اپنے
کو دہرا رہی ہے، سوچنے بیٹھئے تو اپنی زندگی قابلِ
صد نفریں و مستحق ملامت، اور نہ سوچیئے تو جانِ
عزیز سے بڑھ کر عزیز، لذیذ کوئی شے ممکن نہیں"

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ خیال رکھنے کی ہے کہ طبعی تقاضا و شوق اور چیز ہے اور ہوس اور چیز، بہ قول حضرت اکبرالہ آبادی:-

ع کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں

جو فرق کہنے اور بکنے میں ہے وہی طبعی تقاضے اور ہوس میں ہے:

ع وہ راہبر کی ہدایت، یہ رہ گذر کا فریب

طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جا سکتی ہے لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں، ہوس رانی جتنی بھی کیجیئے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہونے کے حریص سے حریص تر

ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرر و زیاں صریح واقع ہوتا جائے گا، لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا ______ نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے، ہر نفس پرستی، ہر ہوسناکی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرر و زیاں کی کوئی نہ کوئی خوبصورت سی تاویل و توجیہ ہر بار کرے گا اور ھَل مِن مَزِید کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ میں مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رہے گا، لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھئے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہیئے، ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حبِّ جاہ کا ہو، حرصِ مال کا ہو، شہوتِ جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہوجاتی ہے، ایسے موقع پر دست گیری شریعت سے پائیے اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈیئے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجئے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا ______ غصہ اور شہوانیت یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں اور انسانیت کے دشمن قاتل، اگر ان پر نوعمری ہی میں قابو پالیا گیا، انہیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا جب تو خیر ہے ورنہ اگر یہ سنپولے بڑھ کر اژدہے ہوگئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی، سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی

سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی، انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجھلائے گا، پھر بھی بس پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا، ان کے پنجے سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی۔

(۲) روپیہ کی محبّت بھی بڑی بُری بلا ہے، سن کے ساتھ ساتھ یہ گھٹتی نہیں بلکہ حرص وہوس عموماً بڑھ ہی جاتی ہے، اور وجہ جواز میں ذہن نئی نئی ضرورتیں گڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ ضرورت اس وقت سال پر شروع ہی سے قابو پالینے اور اپنے کو قناعت کا خوگر بنا لینے کی ہے، یہ جس نے نہ کیا اسے تلخیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں گی لیکن روپیہ کی محبّت اور شئ ہے اور اس کی قدر اور۔ روپیہ کی محبت تو بے شک ہرگز نہ پیدا ہونے پائے لیکن روپیہ کی قدر ضرور ہو، یہ نہ ہوا تو دوسرا مرض اِسراف کا پیدا ہو کر رہے گا، بخل واسراف دونوں مرض ایک ہی درجہ کے ہیں اور دونوں بڑے سخت، ان کے حملے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ قلب کو ایک طرف حبِّ مال سے خالی رکھا جائے اور دوسری طرف روپیہ کی ناقدری سے۔

(۳) دل کو ریا و نمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان و معمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت ہاتھ آسکتی ہے اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ (اور اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہوتا ہے)

(۴۱ السجدہ : ۳۵)

ایک بڑا دخل اس میں صدقِ دل سے دعا مانگنے کا ہے اور اسباب و ذرائع شہرت سے اپنے کو دور رکھنے کا ہے۔ نفس عاشق ہے جاہ کا، اور انسان ایک حد تک خوشامد پسند طبعاً ہوتا ہے، راہِ اخلاص کا سب سے بڑا رہزن، مداحوں، معتقدوں، مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد و تحسین۔ رضا جوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے تفسیر قرآن تک کے بہ ظاہر سو فی صدی خالص دینی کام کو جب سوچتا ہوں اور اپنے پر جرح کرتا ہوں کہ اگر داد و تحسین خلق مسرت نفس اور مالی منفعت وغیرہ سارے خارجی خیالات کو منتزع (الگ) کر لیا جائے، جب بھی یہی اہتمام و انہماک کام کے لئے باقی رہے گا، تو ضمیر کچھ کانپ سا اٹھتا ہے۔

(۴) "علم" بہ معنی لکھائی پڑھائی، کتابوں کی ورق گردانی کے شوق کا مرض بچپن سے رہا ہے۔ اب بھی طالب علم ہی ہوں، ہر وقت اپنے گرد ایک کتب خانہ چاہتا ہوں، بغیر کتابوں کے وقت کاٹنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بارہا شوقِ مطالعہ کے آگے دوسرے طبعی جسمانی شوقوں کو مغلوب کر چکا ہوں، لیکن پھر بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس سے ہوتا کیا ہے، اور اس سے حاصل کیا، جب تک یہ دھن تمام تر رضائے حق کی خاطر نہ ہو، دنیا میں بالفرض اردو کا نامی مصنف اور گرامی اہل قلم کہہ کر پکارا بھی گیا تو حشر میں یہ القاب کیا نفع پہنچائیں گے اور حیاتِ ابدی کے حصول میں یہ کیا کام آئیں گے؟

(۵) بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد یہ پرزور وصیت سارے ناظرین سے ہے کہ دنیا سے دل ہرگز نہ

لگائیں اور اس کے مکر و فریب میں نہ آئیں جس کے صدہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن انسان بہر حال جسم وجد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے، اس حکمت کی بھی رعایت رکھنا لازمی ہے۔ دنیا کو برتئے مگر دل نہ لگائیے، دل تو آخرت ہی سے لگائے رہیئے۔ اکبر ہی کے لفظوں میں:

ع غافل نے اِدھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

دیکھئے! ابھی کتنی اور میعاد کاٹنا ہے، دل تو اسی مژدہ جاں بخش کے سننے کو تڑپ رہا ہے کہ: اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (ترجمہ) "تو اپنے پروردگار کی طرف چل خوش ہوتی ہوئی اور خوش کرتی ہوئی، پھر تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں جا داخل ہو۔" (الفجر ۲۸ تا ۳۰)

اپنے حق میں تو بس ایک ہی اور آخری دعا یہ ہے کہ بلاوا اس وقت آئے جب یہ ناکارہ اور آوارہ قلم، دین کی خدمت میں مشغول ہو اور کسی عدوّاللہ کے ہفوات کا جواب دے رہا ہو یا اپنے محبوب کی کسی ادا کی معرفت کی دعوت دے رہا ہو۔

(آپ بیتی، صفحہ ۳۷۶ تا ۳۸۱)

مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے عالِم جذبات انسانی، ماہرِ نفسیات، تجربہ کار، زمانہ شناش، نبّاضِ وقت اور داعی و مصلح کی حیثیت سے سوزِ دروں اور دل کی تڑپ کے ساتھ جو کچھ کہا اور بتایا ہے، وہ "رہبرِ زندگی" اور "چراغِ راہ" ہے، مولانا

دریابادیؒ کی دین و دانش اور ہوش و خرد سے بھرپور باتوں کے پسِ منظر میں میرؔ کا یہ شعر ایک انسان کو "میرِ کارواں" بنانے کے لئے کتنا اونچا پیغام دیتا ہے :

ؔ

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے

اِس کتاب سے

"عبادت کے ذوق و شوق سے اپنی رُوح کو توانا کرنا اور آخرت کو بنانا چاہیے، مالک اور ملازم، آقا اور حاکم ایک دوسرے کے حقوق پورے طور پر ادا کرتے رہیں، تقویٰ اور پرہیزگاری فضیلت کا معیار ہے نہ کہ حسب نسب اور قبیلہ و خاندان ــــ وطن، علاقہ، زبان، رنگ اور نسل کی عصبیتیں ملک اور سماج میں تباہی اور بربادی لاتی ہیں، اُخوت اور مساوات کے درس کو عام کرنا چاہیے۔ ہر موقع اور ہر کام کے لیے آداب بتا دیے گئے ہیں، جن کی رعایت سے کام میں برکت، سہولت اور زینت آتی ہے، صبح و شام اور روز و شب کے لیے دعائیں ہیں، جن کے اہتمام سے خدا سے تعلق مستحکم ہوتا ہے اور اعمال میں نورانیت آتی ہے۔

عُمر کی کوئی بھی منزل ہو، اُسے ذمہ دارانہ اور حوصلہ مندانہ گزارنا چاہیے۔ عقلمند شخص کے شب و روز کی تقسیم، زندگی کا راز بتانے والے نبیؐ نے اس طرح کی ہے کہ:

۱ : وہ خدا سے باتیں کرے (عبادت و طاعت کے ذریعہ)۔

۲ : اپنی ذات کا محاسبہ کرے۔

۳ : خدا کی تخلیق میں غور کرے۔

۴ : کھانے پینے کی ضرورتوں کے لیے وقت نکالے۔

آپؐ کے فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وقت نہایت قیمتی ہے اس کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"